باقیاتِ اقبال

اقبال

بے نیازانہ ز شوریدہ نوایم مگذر

مرغ لاہوتم و از دوست پیامے دارم

باقیاتِ اقبال

مرتّبہ

سیّد عبدالواحد معینی ایم۔اے (آکسن)

معتمد مجلسِ اقبال کراچی

سول ایجنٹ

شیخ محمد اشرف تاجر کتب کشمیری بازار لاہور

قیمت تین روپے آٹھ آنے

فہرست مضامین

شمار	عنوان	صفحہ	شمار	عنوان	صفحہ
۱	دیباچہ		۱۶	غزل	۷۵
۲	تقریظ مولانا عبدالحق		۱۷	عرض بہ جناب حضرت نظام الدین اولیاؒ	۷۹
۳	کلام زمانۂ طالب علمی	۱۱	۱۸	دربارِ بہاول پور	۸۵
۴	ایک یتیم کا خطاب ہلال عید سے	۱۳	۱۹	اہل درد	۹۶
۵	ہلال عید	۱۴	۲۰	دیگر	۹۹
۶	دُنیا	۱۵	۲۱	سپاسِ جناب امیرؑ	۱۰۲
۷	مفلسی	۱۶	۲۲	مدینے کے کبوتر کی یاد	۱۰۶
۸	شام	۱۷	۲۳	قطعہ، نعت	۱۰۷
۹	فریادِ اُمّت	۱۸	۲۴	ترجمہ از ڈانگ	۱۱۰
۱۰	نالۂ یتیم	۴۲	۲۵	غزل	۱۱۱
۱۱	شکریۂ انگشتری	۶۰	۲۶	غزل	۱۱۲
۱۲	غزل	۶۳	۲۷	غزل	۱۱۳
۱۳	ماتمِ پسر	۶۴	۲۸	قطعہ	۱۱۴
۱۴	خطِ منظوم	۶۶	۲۹	غزل	۱۱۵
۱۵	آفتاب	۶۷	۳۰	غزل	۱۱۶

شمار	عنوان	صفحہ	شمار	عنوان	صفحہ
۳۱	حیدر آباد دکن	۱۱۷	۴۵	غزل	۱۳۷
۳۲	مکافاتِ عمل	۱۲۱	۴۶	قطعہ	۱۳۹
۳۳	قطعہ	۱۲۲	۴۷	مولانا محمد علی کی وفات پر	۱۴۱
۳۴	پیش کش	۱۲۳	۴۸	دُعا	۱۴۲
۳۵	تاریخ وفات شیخ عبدالحق	۱۲۵	۴۹	متفرقات	۱۴۳
۳۶	تاریخ وفات میاں شاہدین ہمایوں	۱۲۶			تا
۳۷	تاریخ فتح سمرنا	۱۲۶			۱۶۰
۳۸	خلافت اور ترک دعب	۱۲۷	۵۰	ظریفانہ	۱۶۱
۳۹	مرگ قوم	۱۲۸			تا
۴۰	جلیانوالہ باغ امرتسر	۱۲۹			۱۶۸
۴۱	مرثیہ اکبر الہ آبادی	۱۳۰	۵۱	یتیم کا خطاب ہلال عید سے	۱۶۹
۴۲	حالی اور اقبال	۱۳۱			تا
۴۳	عرشی، اقبال اور ظفر علی خاں	۱۳۴			۱۸۴
۴۴	غزل	۱۳۶	۵۳	حافظ شیرازی	۱۸۵

نذرِ عقیدت

درسِ ماضی از کتابِ حال گیر — ساغر از خمخانۂ اقبال گیر

حضرتِ اقبال آں بالغ نظر — دارد از بود و نبودِ ما خبر

ما بہ ذوقِ سوختن کم ساختیم — بیخودی را از خودی نشناختیم

آں نوا پردازِ اسرارِ ازل — شہسوارِ عرصۂ علم و عمل

بیخودی را در خودی منزل شناس — در غبارِ کاروان محمل شناس

از نوائش بزمِ یورپ در خروش — حکمتِ امریکیہ اورا سفتہ گوش

نالہ ہائے آتشینِ آں حکیم — سوخت رختِ فتنۂ امید و بیم

ساخت با دلہا و بودش ہیچ نیست

سوخت دلہا را و دودش ہیچ نیست

گرامی

نہ از ساقی نہ از پیمانہ گفتم
حدیثِ عشق بے باکانہ گفتم
شنیدم آں چہ از پاکانِ امت
ترا با شوخیٔ رندانہ گفتم

انتساب

میں اِس مجموعۂ کلامِ اقبالؒ کو اپنے پیارے جوانمرگ برادر زادہ سید عبدالاحد معینی اجمیری ایم ۔ اے ۔ ایل ۔ ایل ۔ بی سابق سب جج اجمیر کے نام پر معنون کرتا ہوں ۔ مرحوم نے اِس مجموعہ کی ترتیب میں میری بے حد مدد کی تھی ۔

آج مرحوم حیدر آباد (سندھ) میں اپنے پروردگار کی آغوشِ رحمت میں ہمیشہ کی نیند سو رہا ہے ۔ اگر وہ زندہ ہوتا تو اِس مجموعہ کے مطالعہ سے بے حد محظوظ ہوتا ۔

اے روشنئ دیدۂ روشن چگونۂ — من بے تو تیرہ روز و تو بے من چگونۂ
ماتم سراست خانۂ من در فراقِ تو — تو زیرِ خاک ساختہ مسکن چگونۂ

بر خار و خس کہ بستر و بالینِ خوابِ تست
اے یاسمن عذارِ سمن تن چگونۂ

پیش لفظ

اِس مختصر مجموعے میں حضرت اقبال رح کے اس کلام کو شائع کیا جا رہا ہے جو ان کی مطبوعہ تصانیف میں نہیں ہے۔ مدتوں علاّمہ مرحوم کا یہ دستور رہا کہ جب کوئی نظم لکھتے تو اس کو کسی رسالے میں اشاعت کے لیے بھجوا دیتے یا کسی دوست کو دیدیتے۔ جب علامہ کو اُردو کلام کے پہلے کلیات کے شائع کرنے کا خیال آیا تو جو نظمیں بآسانی دستیاب ہو سکیں یا جو ان کو یاد تھیں صرف وہی نظمیں اس میں شامل کر دی گئیں۔ بانگ درا کی اشاعت سے پہلے اکثر عقیدتمندانِ اقبال رح کا یہ دستور تھا کہ جب علامہ مرحوم کا کلام کسی رسالہ میں شائع ہوتا تو اس کو جمع کر لیتے۔ علامہ کا بیشتر کلام مخزن اور زمیندار میں شائع ہوتا تھا۔ مگر کبھی کبھی پنجاب کے دوسرے اخبارات میں بھی شائع ہو جاتا تھا۔ غرضکہ اس کلام کا جمع کرنا آسان نہ تھا۔ مگر دلدادگانِ اقبال رح ہمہ تلاش میں رہتے تھے اور اکثر اصحاب کے پاس بانگِ درا کی اشاعت سے پہلے ہی کلامِ اقبال رح

کا کافی ذخیرہ موجود تھا۔ اس میں سے ایک شیخ عبدالحمید صاحب ایم۔ اے علیگڈھ میں طالب علم تھے۔ ان کے پاس علامہ مرحوم کے کلام کا ایک نایاب مجموعہ تھا۔ یہ صاحب بڑی دریا دلی سے دوستوں کو اس مجموعہ سے استفادہ کا موقع دیا کرتے تھے۔ دوسرے صاحب مولوی عبدالرزاق حیدر آبادی ہیں۔ ان کو علامہ کے کلام سے عشق تھا۔ عبدالرزاق صاحب نے بعد میں اپنا مجموعہ کلیاتِ اقبال کے نام سے شائع کر دیا۔ میں نے عبدالرزاق صاحب کے مشورہ اور ان کے مرتّبہ کلیات سے بھی پورا فائدہ اُٹھایا۔ جب میں سری نگر گیا تو وہاں منشی سراج الدین صاحب مرحوم کی ضخیم بیاضوں میں علامہ کی بہت سی غیر مطبوعہ نظمیں ملیں۔ منشی صاحب کو قدرت نے شعر و سخن کا عجیب ذوق عطا کیا تھا اور وہ جب تک زندہ رہے سری نگر اُن کی وجہ سے ایک ادبی مرکز بنا رہا۔ علامہ مرحوم سے ان کے نہایت دوستانہ تعلقات تھے اور خط و کتابت رہتی تھی۔ علامہ ان کو اکثر اپنا کلام بھیجتے رہتے تھے۔ منشی صاحب ان خطوط کو جن پر علامہ کا کلام ہوتا تھا نہایت احتیاط سے بیاض میں چسپاں کر کے رکھ لیا کرتے تھے۔ عالی جناب دین محمد صاحب گورنر سندھ نے بھی میری رہنمائی فرمائی۔ دین محمد صاحب علامہ مرحوم کے دوستوں میں سے

ہیں اور ان کو علامہ کا بیشتر کلام حفظ یاد ہے ۔ حیدر آباد دکن میں بعض احباب نے میری مدد فرمائی اور جناب ڈاکٹر محی الدین صاحب قادری زور کے نایاب کتب خانہ سے بے حد مدد ملی ۔ اس کتب خانہ میں اُردو رسائل وجرائد کی مکمل جلدیں موجود ہیں ۔ ان سے بھی فائدہ اٹھایا غرض گذشتہ چالیس سال سے کلام اقبال کا جمع کرنا میرا محبوب مشغلہ رہا ہے ۔ اور اس کے لیے میں نے اکثر طویل سفر بھی اختیار کیے ۔

غبارِ راہ گشتم سر بہ گشتم طوطیہ گشتم
بچندیں رنگ گشتم تا بچشمت آشنا گشتم

میری ان ناچیز کوششوں کے نتیجہ میں میرے پاس علامہ کے اس کلام کا جو ان کی کسی مطبوعہ کتاب میں شامل نہیں ہے کافی ذخیرہ جمع ہو گیا ۔ بعض احباب نے اس مجموعہ کی اشاعت کے لیے اصرار کیا ۔ بعض نے اس وجہ سے اشاعت سے منع فرمایا کہ خود علامہ نے جس کلام کو اپنے کسی کلیات میں شائع نہ کیا تھا اس کو کیوں شائع کیا جائے ۔ غرض میں اس کشمکش میں تھا کہ میری ملاقات لندن میں ۱۹۳۶ء میں شفیق محترم سر عبدالقادر مرحوم سے ہوئی جب

میں نے اپنے مجموعہ کا ذکر صاحب موصوف سے کیا تو اُنہوں نے نہایت شدت اس مجموعہ کی اشاعت پر زور دیا۔ انڈیا آفس لندن میں بیٹھے ہوئے سر عبدالقادر نے بار بار فرمایا کہ علامہ نے کبھی غالب کی طرح اشاعت کے لیے اپنے کلام کا انتخاب نہیں کیا تھا۔ بلکہ جب اُن کو اپنے اُردو کلام کی اشاعت کا خیال آیا تو علامہ نے اپنے احباب سے کلام جمع کر کے بانگِ درا کو مرتب کیا تھا۔ اِس سلسلہ میں ایک صاحب عبدالغفور صاحب ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس کے پاس بہت نایاب ذخیرہ تھا۔ اس ذخیرہ سے علامہ کو بانگِ درا کی ترتیب میں بڑی مدد ملی۔ مگر اس کے باوجود علامہ مرحوم کو اپنی بہت سی نظموں کا تو خیال بھی نہیں رہا تھا۔ جب سر عبدالقادر ۱۹۴۲ء میں حیدرآباد دکن تشریف لائے تو پھر اصرار کیا کہ میں اپنا مجموعہ جلد ایسی اپیل کے ساتھ شائع کر دوں کہ جن اصحاب کے پاس علامہ کا دوسرا کلام محفوظ ہو وہ آئندہ اشاعت کے لیے ارسال کر دیں۔ پھر جب کبھی صاحب موصوف کی خدمت میں لاہور حاضر ہونے کا موقعہ ملا تو اُنہوں نے ہمیشہ اس خواہش اشاعت کی بار بار تکرار کی میری خواہش یہ تھی کہ اس مجموعہ پر سر عبدالقادر ہی تقریظ تحریر فرمائیں، مگر میری یہ خواہش

پوری نہ ہو سکی ۔ ع

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

آج مرحوم کی آخری خواہش کے مطابق یہ مجموعہ عقیدتمندانِ اقبالؒ کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے ۔ میرے لیے تو حضرتِ اقبالؒ کے متعلق کوئی کام تصنیف تالیف یا ترتیب سرمایۂ زندگی ہے ۔

عشقِ شور انگیز را ہر جادہ در کوئے تو بُرد
بر تلاشِ خود چہ مے نازد کہ رہ سوئے تو بُرد

میں کسی حد تک مجموعے کی خامیوں سے واقف ہونے کے باعث اب تک اس کی اشاعت میں پس و پیش کرتا رہا ہوں اور شاید اب بھی پس و پیش کرتا مگر اب جبکہ اقبالؒ کے بے شمار شیدائیوں اور میرے کرم فرماؤں کے تقاضے حد سے بڑھنے لگے ہیں اور مزید برآں اس سلسلے میں جب مجھے مرحوم عبدالقادر مرحوم کے زبردست تقاضہ کا خیال آتا ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ اب اس مجموعے کی اشاعت میں مزید تعویق قطعاً مناسب نہیں ہر نظم کے متعلق جو اس مجموعہ میں شامل ہے حتی الوسع تحقیقات کر لی گئی ہے کہ یہ نظم

علامہ مرحوم ہی کی ہے۔ پھر بھی اگر کسی صاحب کی رائے میں کوئی غلطی رہ گئی ہو تو از راہِ کرم راقم الحروف کو مطلع فرمائیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس مجموعہ میں کچھ ایسے اشعار شائع ہو گئے ہوں جو علامہؒ کے مطبوعہ کلام میں موجود ہوں اور اپنے حافظہ کی غلطی سے میں نے اس مجموعہ میں بھی ان کو شامل کر لیا ہو۔ اگر ناظرین کرام نے میری مدد کی تو قوی امید ہے کہ یہ تمام خامیاں آئندہ اشاعت میں دور ہو جائیں گی۔ ناظرینِ کرام سے یہ بھی درخواست ہے کہ اگر ان کے پاس علامہ مرحوم کا ایسا کلام ہو جو ابھی تک شائع نہیں ہوا ہے تو اس کو براہِ کرم ارسال فرمادیں تاکہ آئندہ اشاعت کے وقت اس کو بھی باقیاتِ اقبالؒ میں شامل کر لیا جائے۔ میری دلی خواہش ہے کہ اس نو پردازِ اسرارِ ازل کا ہر لفظ جو بقول مولانا سلیمان ندوی گوشوارۂ حقیقت ہے آئندہ نسلوں کے لیے محفوظ کر لیا جائے۔ موجودہ مجموعہ کی ترتیب میں دو باب 'متفرقات' اور 'ظریفانہ' تو علیحدہ قائم کر دیے گئے ہیں مگر دوسری نظموں کی ترتیب میں سوائے اس کے کہ یہ کوشش کی گئی ہے کہ نظموں کو تاریخ وار درج کیا جائے کوئی اصول ملحوظ نہیں رکھا گیا ہے۔ جن نظموں کے سال تصنیف کا تعین ممکن تھا اس کا بھی تذکرہ کر دیا گیا

ہے۔ الغرض راقم الحروف نے اس مجموعہ کو عقیدتمندانِ اقبالؒ کے لیے دلچسپ بنانے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا ہے۔ اور اگر تائیدِ ایزدی شاملِ حال رہی تو یہ کوشش برابر جاری رہے گی۔ السعی منی والاتمام من اللہ۔

یکم جنوری سنہ ۵۲ء
نمبر ۱۰ کچہری روڈ کراچی

سید عبدالواحد
معتمد مجلس اقبال

تقریظ مولانا عبدالحق

نمبر فون ۲۷۸۴۳

انجمن ترقی اُردو پاکستان

اسپتال روڈ ۔ کراچی ۱

مورخہ ۲۵ر دسمبر ۱۹۵۱ء

نمبر ________

عبدالواحد صاحب نے کمال کیا کہ علامہ اقبال
کا غیر مطبوعہ کلام ایک جا جمع کر کے شائع کر دیا ۔ اگر کہ
تلاش میں وہ کہاں کہاں پھرے ہیں اور ایسے ایسے نامعلوم
گوشوں ، بھولی بسری صحبتوں اور گمنام بیاضوں تک پہنچ کر
جہاں رسائی مشکل تھی ۔ یہ جواہرات جمع کیے ہیں ۔
مرزا غالب نے اپنے کلام کا انتخاب شائع کیا تھا
اور یہ لکھ دیا تھا کہ کہیں سے اگر کوئی میرا کلام پیش کرے
تو ہرگز میرا کلام نہ سمجھا جائے ۔ مگر باوجود اس کے اُن
کے پرستاروں نے اُن کا ایک ایک شعر اور ایک ایک رقعہ
ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالا اور شائع کیا ۔ اس تلاش میں وہ
نسخہ بھی ہاتھ آ گیا جو مرزا نے تحفتاً بھوپال کے
فوجدار خاں کو پیش کیا تھا اور جو نسخۂ حمیدیہ کے نام سے
شائع ہوا ۔ اس میں بعض ایسے نایاب اور بلند پایہ
شعر نکلے جو انتخاب کے وقت مرزا کی نظر سے اوجھل تھے

یا حافظے سے جاتے رہے اور اس سے مطبوعہ کلام میں
شامل ہونے سے رہ گیا۔
بہر صورت اب اس کلام کی بازیافت عبدالواحد صاحب
نے جمع کیا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اگر یہ علامہ ممدوح کے
سامنے یہ مجموعہ ہوتا تو اس میں سے کس قدر حصہ شائع کرتے۔
اس کلام کا جمع اور شائع کرنے کی سعادت عبدالواحد صاحب
کی قسمت میں تھی۔ یہ انھوں نے ایسا نادر اور یادگار
کام کیا ہے جس کے لیے وہ قابل مبارکباد اور مستحق شکریہ
ہیں۔ خاص کر کلام اقبال کے قدردانوں کو ان کا
تہ دل سے شکرگزار ہونا چاہیے۔

کلامِ زمانۂ طالب علمی

مندرجہ ذیل رباعیاں اقبالؒ نے کشمیری کانفرنس کے مختلف اجلاس میں پڑھی، اور بعد میں کشمیری گزٹ یا کانفرنس کی رپورٹوں میں شائع ہوئیں۔ اکثر احباب کو یہ رباعیاں زبانی بھی یاد ہیں۔ لہذا ان کے کلام اقبالؒ ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔

سو تدابیر کی اے قوم یہ ہے اک تدبیر
چشمِ اغیار میں بڑھتی ہے اسی سے توقیر
درِ مطلب ہے اخوت کے صدف میں پنہاں
مل کے دنیا میں رہو مثلِ حروفِ کشمیر

کہکشاں ہیں ایسے اختر سب مل گئے
اک اکائی ہیں اکے جو ہم مل گئے
واہ وا کیسے مہِ منزلِ احباب ہے آج
ہم وطن غربت میں ہیں آکر مل گئے

موتی عدن سے لعل ہوا ہے یمن سے دور
یا نافۂ غزال ہوا ہے ختن سے دور
ہندوستاں میں آئے ہیں کشمیر چھوڑ کر
بلبل نے آشیانہ بنایا چمن سے دور

سامنے ایسے گلستاں کے کبھی گر نکلے
جیب خجلت سے سر طور نہ باہر نکلے
ہے جو ہر خطہ تجلی گہ مولائے جلیل
عرش و کشمیر کے اعداد برابر نکلے

پنجۂ ظلم و جہالت نے برا حال کیا
بن کے مقراض ہمیں بے پر و بے بال کیا
توڑ اس دست جفا کیش کو یا رب جس نے
روحِ آزادیِ کشمیر کو پامال کیا

بت پرستی کو مرے پیش نظر لاتی ہے
یاد ایام گزشتہ مجھے شرماتی ہے
ہے جو پیشانی پہ اسلام کا ٹیکا اقبال
کوئی پنڈت مجھے کہتا ہے تو شرم آتی ہے

ایک یتیم کا خطاب ہلالِ عید سے

علامہ مرحوم نے یہ نظم انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ جلسہ میں پڑھی تھی۔ اس کے بعد بعض اخبارات میں شائع ہوئی۔ مگر میں کوشش کے باوجود اس نظم کے حاصل کرنے میں ناکام رہا۔ یہ مرقومہ ذیل اشعار اور بند تیمناً درج کیے جاتے ہیں تاکہ پوری نظم کے حاصل کرنے کی کوشش کا سلسلہ جاری رہ سکے۔

اک بہانہ ہلالِ عید کا ہے
قوم کو حالِ دل سناتے ہیں
کِس مزے کی ہے داستاں اپنی
قوم سنتی ہے ہم سناتے ہیں

ہلالِ عید

اے مہِ عید بے حجاب ہے تو | حسنِ خورشید کا جواب ہے تو
اے گریبانِ جامۂ شبِ عید | شاہدِ عیش کا شباب ہے تو
اے نشانِ رکوعِ سورۂ نور | نقشۂ کلکِ انتخاب ہے تو
اے جوابِ خطِ رکوعِ نیاز | طاعتِ صوم کا ثواب ہے تو
ہائے اے حلقۂ پرِ طاؤس | قابلِ ذالک الکتاب ہے تو
چشمِ طفلی نے جب تجھے دیکھا | کہہ دیا خواب ہے کہ خواب ہے تو
طوفِ منزل گہِ زمیں کے لیے | ہمہ تن پائے در رکاب ہے تو
یہ اُبھرتے ہی آنکھ سے چھپنا | روشنی کا مگر حباب ہے تو

تو کمندِ غزالِ شادی ہے
لذت افزائے شورِ طفلی ہے

دنیا

چمنِ خار خار ہے دنیا
خونِ صد نو بہار ہے دنیا

ہے تمنا فزا ہوائے جہاں
کیا شکستِ خمار ہے دنیا

جان لیتی ہے جستجو اس کی
دولتِ زیرِ مار ہے دنیا

ہے نسیمِ جہاں خزاں پرور
دیکھنے کو بہار ہے دنیا

زندگی نام رکھ دیا کس نے
موت کا انتظار ہے دنیا

خون روتا ہے شوقِ منزل کا
رہزنِ رہ گزار ہے دنیا

خندہ زن ہے فلک زدوں پہ جہاں
چرخ کی راز دار ہے دنیا

ہیں جہاں کو غموں کے خار پسند
اس چمن کو نہیں بہار پسند

مفلسی

ہاتھ اے مفلسی صفا ہے ترا
ہائے کیا تیر بے خطا ہے ترا

تیرہ روزی کا ہے تجھی پہ مدار
بد نصیبی کو آسرا ہے ترا

مایۂ صد شکست قیمتِ دل
دہر میں ایک سامنا ہے ترا

مسکراتا ہے تجھ کو دیکھ کے زخم
یہ کوئی صورت آشنا ہے ترا

موت مانگے سے بھی نہیں آتی
درد کیا زندگی فزا ہے ترا

شورِ آوازِ چاکِ پیراہن
لبِ اظہارِ مدعا ہے ترا

التجا پر خموشیِ منعم
ایک فقرہ جلا بھنا ہے ترا

ہے جو دل میں نہاں کہیں کیونکر
ہائے تیرے ستم سہیں کیونکر

شام

مصرِ ہستی میں شام آتی ہے — رنگ اپنا جمائے جاتی ہے

اے سبوئے مے شفق، اے شام! — تو مے بے خودی پلاتی ہے

سُرمۂ دیدۂ اُفق بن کر — چشمِ ہستی میں تو سماتی ہے

کس خموشی سے اُڑ رہے ہیں طیور — تو رہِ آشیاں دکھاتی ہے

ریزشِ دانہ ہائے اختر کو — مزرعِ آسماں میں آتی ہے

تو پرِ طیرِ آشیاں رَو کو — چشمِ صیاد سے چھپاتی ہے

صبح در آستیں ہے تو شاید — آنکھ اختر کی کھلتی جاتی ہے

تو پیامِ وفاتِ بیداری — محفلِ زندگی میں لاتی ہے

اپنے دامن میں بہرِ غنچۂ گل — خواب لے کر چمن میں آتی ہے

خامشی زا ہے تیرا نظارہ

آہ! یہ حُسنِ انجمن آرا

فریادِ اُمت

یہ نظم لاہور کے ایک ناشر نے مندرجہ ذیل شذرہ کے ساتھ شائع کی تھی۔

"وہ مقبول نظم جو جناب ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب ایم۔اے نے قریباً ۱۳ سال ہوئے انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ جلسے میں (تخیلاً بآستانہ سرورِ کائنات خلاصۂ موجودات) عاشقانہ فریاد کے رنگ میں (ابرِ گہربار کے عنوان سے) پڑھی تھی۔ ازاں بعد ۱۹۱۳ء میں (باجازت مصنف) 'فریادِ امت' کے نام سے چھاپ دی گئی۔

دل میں جو کچھ ہے نہ لب پر اُسے لاؤں کیوں کر
ہو چھپانے کی نہ جو بات چھپاؤں کیوں کر
شوقِ نظارہ یہ کہتا ہے قیامت آئے
پھر میں نالوں سے قیامت نہ اُٹھاؤں کیوں کر

میری ہستی نے رکھا مجھ سے تجھے پوشیدہ
پھر تری راہ میں اس کو نہ مٹاؤں کیوں کر

صدمۂ ہجر میں کیا لطف ہے اللہ اللہ
یہ بھی اک ناز ہے تیرا نہ اُٹھاؤں کیوں کر

زندگی تجھ سے ہے اے نارِ محبت میری
اشکِ غم سے ترے شعلوں کو بجھاؤں کیوں کر

تجھ میں سو نغمے ہیں اے تارِ ربابِ ہستی
زخمۂ عشق سے تجھ کو نہ بجاؤں کیوں کر

ضبط کی تاب نہ یارائے خموشی مجھ کو
ہائے اِس دردِ محبت کو چھپاؤں کیوں کر

بات ہے راز کی پر مُنہ سے نکل جائے گی
یہ مئے کہنۂ خُمِ دل سے اُچھل جائے گی

آسماں مجھ کو بجھا دے جو فروزاں ہوں میں

صورتِ شمع سرِ گورِ غریباں ہوں میں

ہوں وہ بیمار جو ہو فکرِ مداوا مجھ کو

درد چپکے سے یہ کہتا ہے کہ درماں ہوں میں

دیکھنا تو مری صورت پہ نہ جانا گل چیں

دیکھنے کو صفت نو گل خنداں ہوں میں

موت سمجھا ہوں مگر زندگیٔ فانی کو

نام آجائے جو اس کا تو گریزاں ہوں میں

دور رہتا ہوں کسی بزم سے اور جیتا ہوں

یہ بھی جینا ہے کوئی جس سے پشیماں ہوں میں

کنجِ عزلت سے مجھے عشق نے کھینچا آخر

یہ وہی چیز ہے جس چیز پہ نازاں ہوں میں

داغِ دل مہر کی صورت ہے نمایاں لیکن

ہے اسے شوق ابھی، اور نمایاں ہوں میں

ضبط کی جا کے سنا اور کسی کو ناصح

اشک بڑھ بڑھ کے یہ کہتا ہے کہ طوفاں ہوں میں

ہوں وہ مضمون کہ مشکل ہے سمجھنا میرا

کوئی مائل ہو سمجھنے پہ تو آساں ہوں میں

رند کہتا ہے ولی مجھکو۔ ولی رند مجھے

سن کے ان دونوں کی تقریر کو حیراں ہوں میں

زاہدِ تنگ نظر نے مجھے کافر جانا

اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلماں ہوں میں

کوئی کہتا ہے کہ اقبال ہے صوفی مشرب

کوئی سمجھا ہے کہ شیدائے حسیناں ہوں میں

ہوں عیاں سب پہ مگر پھر بھی ہیں اتنی باتیں
کیا غضب آئے نگاہوں سے جو پنہاں ہوں میں

دیکھ اے چشم عدو مجھ کو حقارت سے نہ دیکھ
جس پہ خالق کو بھی ہو ناز وہ انساں ہوں میں

مزرعۂ سوختۂ عشق ہے حاصل میرا
درد قربان ہو جس دل پہ وہ ہے دل میرا

قصّۂ دار و رسن بازیٔ طفلانۂ دل
التجائے ارنی سُرخیٔ افسانۂ دل

یارب اِس ساغرِ لبریز کی مے کیا ہو گی
جادۂ ملک بقا ہے خطِ پیمانۂ دل

ابرِ رحمت تھا کہ تھی عشق کی بجلی یارب
جل گئی مزرعۂ ہستی تو اُگا دانۂ دل

حُسن کا گنج گرانمایہ تجھے مل جاتا
تونے فرہاد! نہ کھودا کبھی ویرانۂ دل

عرش کا ہے کبھی کعبہ کا ہے دھوکا اس پر
کس کی منزل ہے الٰہی مرا کاشانۂ دل

کچھ اسی کو ہے مزا دہر میں آزادی کا
جو ہوا قیدیٔ زنجیرِ پری خانۂ دل

اس کو اپنا ہے جنوں اور مجھے سودا اپنا
دل کسی اَور کا دیوانہ - میں دیوانۂ دل

تو سمجھتا نہیں اے زاہدِ ناداں اس کو
رشکِ صد سجدہ ہے اک لغزشِ مستانۂ دل

ہائے کیا جانئے اِس گھر کا مکیں کیسا ہو
ہوں جو منصور سے دربانِ درِ خانۂ دل

خاک کے ڈھیر کو اکسیر بنا دیتی ہے
وہ اثر رکھتی ہے خاکستر پروانۂ دل

عشق کے دام میں پھنس کر یہ رہا ہوتا ہے
برق گرتی ہے تو یہ نخل ہرا ہوتا ہے

آتی ہے اپنی سمجھ اور پہ مائل ہو کر
آنکھ کھل جاتی ہے انسان کی بے دل ہو کر

لوگ سودا کو یہ کہتے ہیں "بُرا ہوتا ہے"
عقل آئی مجھے پابند سلاسل ہو کر

آرزو کا کبھی رونا۔ کبھی اپنا ماتم
اِس سے پوچھے کوئی، کیا دل نے لیا دل ہو کر

میری ہستی ہی جو تھی میری نظر کا پردہ
اُٹھ گیا بزم سے میں پردۂ محفل ہو کر

عین ہستی ہوا ہستی کا فنا ہو جانا
حق دکھایا مجھے اِس نقطہ نے باطل ہو کر

خلق معقول ہے محسوس ہے خالق اے دل
دیکھ - نادان ذرا آپ سے غافل ہو کر

طور پر تو نے جو اے دیدۂ موسیٰ دیکھا
وہی کچھ قیس نے دیکھا پسِ محمل ہو کر

کیا کہوں بے خودیٔ شوق میں لذت کیا ہے
تو نے دیکھا نہیں زاہد کبھی غافل ہو کر

راہِ الفت میں رواں ہوں کبھی افتادہ ہوں
موج ہو کر - کبھی خاکِ لبِ ساحل ہو کر

دمِ خنجر میں دمِ ذبح سما جاتا ہوں
جوہرِ آئینۂ خنجرِ قاتل ہو کر

وہ مسافر ہوں ملے جب نہ پتا منزل کا

خود بھی مٹ جاؤں نشانِ رہ منزل ہو کر

ہے فروغِ دو جہاں داغِ محبت کی ضیا

چاند یہ وہ ہے کہ گھٹتا نہیں کامل ہو کر

دیدۂ شوق کو دیدار نہ ہو کیا معنی

آئے محفل میں جو دیدار کے قابل ہو کر

عشق کا تیر قیامت تھا الٰہی توبہ

دل تڑپتا ہے مرا طائرِ بسمل ہو کر

مئے عرفاں سے مرا کاسۂ دل بھر جائے

میں بھی نکلا ہوں تری راہ میں سائل ہو کر

المدد سیّد مکّی مدنی العربی

دل و جاں باد فدایت چہ عجب خوش لقبی

لاکھ ساماں ہے اک بے سر و ساماں ہونا
مجھ کو جمعیتِ خاطر ہے پریشاں ہونا

تیری الفت کی اگر ہو نہ حرارت دل میں
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

یہ شہادت گہِ اُلفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

دل جو برباد محبت ہوا آباد ہوا
سازِ تعمیر تھا اِس قصر کو ویراں ہونا

علم و حکمت کے مدینے کی کشش ہے مجھ کو
لطف دے جاتا ہے کیا کیا مجھے ناداں ہونا

کبھی یثرب میں اویسِ قرنی سے چھپنا
کبھی برقِ نگہ موسیِ عمراں ہونا

قابِ قوسین بھی، دعوٰی بھی عبودیت کا
کبھی چلمن کو اُٹھانا۔ کبھی پنہاں ہونا

لطف دیتا ہے مجھے مٹ کے تری اُلفت میں
ہمہ تن شوق ہوائے عربستاں ہونا

یہی اسلام ہے میرا یہی ایماں میرا
تیرے نظارۂ رخسار سے حیراں ہونا

خندۂ صبح تمنائے براہیم استی
چہرہ پرداز بحیرت کدۂ میم استی

حشر میں ابر شفاعت کا گھر بار آیا
دیکھ اے جنسِ عمل تیرا خریدار آیا

پیرہن عشق کا جب حسنِ ازل نے پہنا
بن کے یثرب میں وہ آپ اپنا خریدار آیا

میں گیا حشر میں جس دم تو صدا یوں آئی
دیکھنا دیکھنا وہ کافرِ دیندار آیا

لطف آنے کا تو جب ہے کہ کسی پر آئے
ورنہ دل اپنا بھی آنے کو تو سو بار آیا

جوشِ سودائے محبت میں گریباں اپنا
میں نے دیکھا تو نہ ہاتھوں میں کوئی تار آیا

عشق کی راہ میں اک سیر تھی ہر منزل پر
نجد کا دشت کہیں مصر کا بازار آیا

میں نے سو گلشنِ جنت کو کیا اس پہ نثار
دشتِ یثرب میں اگر زیرِ قدم خار آیا

لیں شفاعت نے قیامت میں بلائیں کیا کیا
عرقِ شرم میں ڈوبا جو گنہگار آیا

وہ مری شرمِ گنہ اور وہ سفارش تیری
ہائے اس پیار پہ کیا کیا نہ مجھے پیار آیا

ہے ترے عشق کا میخانہ عجب میخانہ
یعنی ہشیار گیا اور میں سرشار آیا

ما عرفنا نے چھپا رکھی ہے عظمت تیری
قاب قوسین سے کھلتی ہے حقیقت تیری

لے چلا بحرِ محبت کا طلاطم مجھ کو
کشتیِ نوح ہے ہر موجۂ قلزم مجھ کو

حُسن تیرا مری آنکھوں میں سمایا جب سے
تیر لگتی ہے شعاعِ مہ و انجم مجھ کو

تیرے قربان میں اے ساقیِ میخانۂ عشق
میں نے اک جام کہا تو نے دیے خم مجھ کو

خاک ہو کر یہ ملا اوج تری الفت میں
کہ "فرشتوں نے لیا بہرِ تیمم مجھ کو"

گرد آسا سرِ دامن سے لگا پھرتا ہوں
حشر کے روز بھلا دو نہ کہیں تم مجھ کو

کوئی دیکھے تو ترے عاشقِ شیدا کا مزاج
حور سے کہتا ہے چھیڑا نہ کرو تم مجھ کو

موت آجائے جو یثرب کے کسی کوچے میں
میں نہ اُٹھوں جو مسیحا بھی کہے قُم مجھ کو

صفتِ نوکِ سرِ خارِ شبِ فرقت میں
چبھ رہی ہے نگہِ دیدۂ انجم مجھ کو

خوف رہتا ہے یہ ہر دم کہ رہِ یثرب میں
طور کی سمت نہ لے جائے توہم مجھ کو

تو نے آنکھوں کے اشارے سے جو لتکیں کر دی
شورِ محشر ہوا گلبانگِ ترنم مجھ کو

اپنا مطلب مجھے کہنا ہے مگر تیرے حضور
چھوڑ جائے نہ کہیں تابِ تکلم مجھ کو

ہے ابھی امتِ مرحوم کا رونا باقی
دیکھ اے بے خودی شوق نہ کر گم مجھ کو

ہمہ حسرت ہوں سراپا غمِ بربادی ہوں
ستم دہر کا مارا ہوا فریادی ہوں

اے کہ تھا نوح کو طوفاں میں سہارا تیرا
اور براہیم کو آتش میں بھروسا تیرا

اے کہ مشعل تھا ترا ظلمتِ عالم میں وجود
اور نورِ نگہِ عرش تھا سایا تیرا

اے کہ پرتو ہے ترے ہاتھ کا مہتاب کا نور

چاند بھی چاند بنا پا کے اشارا تیرا

گرچہ پوشیدہ رہا حُسن ترا پردوں میں

ہے عیاں معنیٔ لولاک سے پایا تیرا

ناز تھا حضرتِ موسیٰ کو یدِ بیضا پر

سو تجلی کا محل نقشِ کفِ پا تیرا

چشمِ ہستی صفتِ دیدۂ اعمیٰ ہوتی

دیدۂ کن میں اگر نور نہ ہوتا تیرا

کیا کہوں امت مرحوم کی حالت کیا ہے

جس سے برباد ہوئے ہم وہ مصیبت کیا ہے

حال امت کا بُرا ہو کہ بھلا کہتے ہیں

صفتِ آئنہ جو کچھ ہے صفا کہتے ہیں

واعظوں میں یہ تکبر کہ الٰہی توبہ
اپنی ہر بات کو آوازِ خدا کہتے ہیں

ان کے ہر کام میں دنیا طلبی کا سودا
ہاں مگر وعظ میں دنیا کو بُرا کہتے ہیں

غیر بھی ہو تو اُسے چاہیے اچھا کہنا
پر غضب ہے کہ یہ اپنوں کو بُرا کہتے ہیں

فرقہ بندی کی ہوا تیرے گلستاں میں چلی
یہ وہ ناداں ہیں اسے بادِ صبا کہتے ہیں

آہ جس بات سے ہو فتنۂ محشر برپا
یہ وہ بندے ہیں اسے فتنہ رُبا کہتے ہیں

جن کی دینداری میں ہے آرزوئے زرِ پنہاں
آکے دھوکے میں اُنہیں راہ نما کہتے ہیں

لاکھ اقوام کو دنیا میں اجاڑا اس نے
یہ تعصب کو مگر گھر کا دیا کہتے ہیں

خانہ جنگی کو سمجھتے ہیں بنائے ایماں
مرض الموت ہے جو اُس کو دوا کہتے ہیں

مفسد لحمك لحمی پہ کھلی ان کی زباں
یہ تو اک راہ سے تجھ کو بھی بُرا کہتے ہیں

تیرے پیاروں کا جو یہ حال ہو اے شافع حشر
میرے جیسوں کو تو کیا جانیے کیا کہتے ہیں

بغض للہ کے پردے میں عداوت ذاتی
دین کی آڑ میں کیا کرتے ہیں کیا کہتے ہیں

جن کا یہ دیں ہو کہ اپنوں سے کریں ترکِ سلام
ایسے بندوں کو یہ بندے "صُلحا" کہتے ہیں

قوم کے عشق میں ہو فنا کر کفن بھی نہ جسے
یہ اُسے بندۂ بے دامِ ہوا کہتے ہیں

وصل ہو لیلیٰ مقصود سے کیونکر اپنا
اخترِ سوختہ قیس ہے اختر اپنا

امرا جو ہیں وہ سنتے نہیں اپنا کہنا
سامنے تیرے پڑا ہے مجھے کیا کیا کہنا

ہم جو خاموش تھے اب تک تو ادب مانع تھا
ورنہ آتا تھا ہمیں حرفِ تمنّا کہنا

دردمندوں کا کہیں حال چھپا رہتا ہے؟
اپنی خاموشی بھی تھی ایک طرح کا کہنا

شکوہ منت کشِ لب ہے کبھی منت کشِ چشم
میرا کہنا جو ہے رونا تو ہے رونا کہنا

قوم کو قوم بنا سکتے ہیں دولت والے
یہ اگر راہ پہ آجائیں تو پھر کیا کہنا
بادۂ عیش میں سرمست رہا کرتے ہیں
یاد فرمان نہ تیرا نہ خدا کا کہنا
ہم نے سو بار کہا "قوم کی حالت ہے بُری"
پر سمجھتے نہیں یہ لوگ ہمارا کہنا
دیکھتے ہیں یہ غریبوں کو تو برہم ہو کر
فقر تھا فخر ترا شاہِ دو عالم ہو کر
اس مصیبت میں ہے اک تو ہی سہارا اپنا
تنگ آکر لبِ فریاد ہوا وا اپنا
ایسی حالت میں بھی امید نہ ٹوٹی اپنی
نام لیوا ہیں ترے تجھ پہ ہے دعویٰ اپنا

فرقہ بندی سے کیا راہ نماؤں نے خراب
ہائے ان مالیوں نے باغ اُجاڑا اپنا

ہم نے سو راہ اخوت کی نکالی لیکن
نہ تو اپنا ہوا اپنا نہ پرایا اپنا

دیکھ اے نوح کی کشتی کے بچانے والے
آیا گرداب حوادث میں سفینا اپنا

اس مصیبت میں اگر تو بھی ہماری نہ سنے
اور ہم کس سے کہیں جا کے فسانا اپنا

ہاں برس ابر کرم دیر نہیں ہے اچھی
کہ نہ ہونے کے برابر ہوا ہونا اپنا

لطف یہ ہے کہ پھلے قوم کی کھیتی اس سے
ورنہ ہونے کو تو آنسو بھی ہے دریا اپنا

اب جو ہے ابرِ مصیبت کا دھواں دھار آیا
ڈھونڈتا پھرتا ہے تجھکو دلِ شیدا اپنا

یوں تو پوشیدہ نہ تھی تجھ سے ہماری حالت
ہم نے گھبرا کے مگر تذکرہ چھیڑا اپنا

زندگی تجھ سے ہے اے فخرِ براہیم اپنی
کر دعا حق سے کہ مشکل ہوا جینا اپنا

ایک یہ بزم ہے لے دے کے ہماری باقی
ہے انہی لوگوں کی ہمت یہ بھروسا اپنا

داستاں درد کی لمبی ہے کہیں کیا تجھ سے
ہے ضعیفوں کو سہارے کی تمنّا تجھ سے

قوم کو جس سے شفا ہو وہ دوا کون سی ہے
یہ چمن جس سے ہرا ہو وہ صبا کون سی ہے

جس کی تاثیر سے ہو عزتِ دین و دنیا
ہائے اے شافعِ محشر وہ دعا کون سی ہے

جس کی تاثیر سے یک جان ہو امت ساری
ہاں بتا دے ہمیں وہ طرزِ وفا کون سی ہے

جس کے ہر قطرہ میں تاثیر ہو یک رنگی کی
ہاں بتا دے وہ مئے ہوش رُبا کون سی ہے

قافلہ جس سے رواں ہو سوئے منزل اپنا
ناقہ وہ کیا ہے۔ وہ آوازِ درا کون سی ہے

اپنی فریاد میں تاثیر نہیں ہے باقی
جس سے دل قوم کا پگھلے وہ صدا کون سی ہے

سب کو دولت کا بھروسا ہے زمانے میں مگر
اپنی امید یہاں تیرے سوا کون سی ہے

اپنی کھیتی ہے اُجڑ جانے کو اے ابرِ کرم

تجھ کو جو کھینچ کے لائے وہ ہوا کون سی ہے

ہے نہاں جن کی گدائی میں امیری سب کی

آج دنیا میں وہ بزمِ فقرا کون سی ہے

تیرے قرباں کہ دکھا دی ہے یہ محفل تو نے

میں نے پوچھا جو اخوت کی بنا کون سی ہے

راہ اس محفلِ رنگیں کی دکھا دے سب کو

اور اس بزم کا دیوانہ بنا دے سب کو

"نالۂ یتیم"

سنہ ۱۸۹۹ء

یہ وہ درد انگیز نظم ہے جو علامہ مرحوم نے انجمن حمایت اسلام لاہور کے پندرھویں سالانہ جلسہ میں پڑھی تھی۔

آہ کیا کہیئے کہ اب پہلو میں اپنا دل نہیں
بجھ گئی جب شمع روشن درخورِ محفل نہیں
اے مصافِ نظمِ ہستی میں ترے قابل نہیں
نا امیدی جس کو طے کر لے یہ وہ منزل نہیں
ہائے کس مُنہ سے شریکِ بزمِ میخانہ ہوں میں
ٹکڑے ٹکڑے جس کے ہو جائیں وہ پیمانہ ہوں میں

خارِ حسرت غیرتِ نوکِ سناں ہونے لگا

یوسفِ غم زینتِ بازارِ جاں ہونے لگا

دل مرا شرمندۂ ضبطِ فغاں ہونے لگا

نالۂ دل روشناسِ آسماں ہونے لگا

کیوں نہ وہ نغمہ سرائے رشکِ صد فریاد ہو

جو سرودِ عندلیبِ گلشنِ برباد ہو

پنجۂ وحشت بڑھا چاکِ گریباں کے لیے

اشکِ غم ڈھلنے لگے پابوسِ داماں کے لیے

مضطرب ہے یوں دلِ نالاں بیاباں کے لیے

جس طرح بلبل تڑپتا ہے گلستاں کے لیے

لیں گے ہم ہنگامۂ ہستی میں اب کیا بیٹھ کر

روئیے جا کر کسی صحرا میں تنہا بیٹھ کر

قابلِ عشرت دلِ خو کردۂ حسرت نہیں
درخورِ بزمِ طرب شمعِ سرِ تربت نہیں

زیرِ گردوں شاہدِ آرام کی صورت نہیں
غیرِ حسرت غازۂ رخسارۂ راحت نہیں

صبحِ عشرت بھی ہماری غیرتِ صد شام ہے
ہستیٔ انساں غبارِ خاطرِ آرام ہے

ہے قیامِ بحرِ ہستی جزرِ و مدِّ امید کا
گاہے گاہے آنکلتی ہے مسرت کی ہوا

زندگی کو نورِ الفت سے ملی جس دم ضیا
لے کے طوفانِ ستم ابرِ تغیّر آگیا

ہے کسی کو کامِ دل حاصل کوئی ناکام ہے
اس نظارہ کا مگر خاکِ لحد انجام ہے

اے فلک تجھ سے تمنائے سعادت پروری!
ہر ستارہ ہے ترا داغ دلِ نیک اختری
تو نے رکھا ہے کسے حرماں نصیبی سے بری؟
اے مسلماناں فغاں از دورِ چرخِ چنبری
دوستی از کس نمے بینیم یاراں را چہ شد
دوستی کو آخر آمد دوستداراں را چہ شد

نطق کر سکتا نہیں کیفیتِ غم کو عیاں
اس کی تیزی کو مٹا دیتے ہیں اندازِ بیاں
آ نہیں سکتی زباں تک رنج و غم کی داستاں
خندہ زن میرے لبِ گویا پہ ہے دردِ نہاں
عجزِ گویائی ہے گویا حکمِ قیدِ خامشی
مجرمِ اظہارِ غم کو یہ سزا ملنے لگی

انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز

زخمِ دل کے واسطے ملتا نہیں مرہم مجھے
اپنی قسمت کا ہے رونا صورت آدم مجھے
ظلِ دامانِ پدر کا ہے زبس ماتم مجھے
ہاں ڈبو دے اے محیط دیدۂ پُرنم مجھے

مضطرب اے دل نہ ہونا ذوق طفلی کے لیے
تو بنا ہے تلخی اشکِ یتیمی کے لیے

سایۂ رحمت ہے تو اے ظلِ دامانِ پدر
غنچۂ طفلی پہ ہے مثلِ صبا تیرا گزر
رہنما ہے وادئ عالم میں تو مثلِ خضر
تو تو ہے اک مظہرِ شانِ کریمی سر بسر
ہے شہنشاہی جو طفلی تو ہما تاثیر ہے
تو نہ ہو تو زندگی اک قیدِ بے زنجیر ہے

عینِ طفلی میں ہلالِ آسا کمر خم کھا گئی
صبحِ پیری کی مگر بن کر یتیمی آ گئی
یاد ناکامی اسے کیا جانے کیا سمجھا گئی
شعلہ سوزِ الم کو اور بھی بھڑکا گئی

دم کے بدلے میرے سینے میں دمِ شمشیر ہے
زندگی اپنی کتابِ موت کی تفسیر ہے

جوششِ صرصر سے ہے اے بحر جولانی تری
اور قمر کے دم سے ہے ساری یہ طغیانی تری
کوہ و دریا سے ہے قائم شانِ سلطانی تری
اور شعاعِ مہر سے ہے خندہ پیشانی تری

نظمِ عالم میں نہیں موجود سازِ بے کسی
ہو گئی پھر کیوں یتیمی صیدِ بازِ بے کسی

کھینچ سکتا ہے مصور خندۂ گل کا سماں
اور کچھ مشکل نہیں اے برق تیری شوخیاں
صبح کا ختر نہیں کلکِ تصور پر گراں
اور ہی کچھ ہیں مگر میرے تبسم کے نشاں
یہ تبسم اشکِ حسرت کا نمک پروردہ ہے
دردِ پنہاں کو چھپانے کے لیے اک پردہ ہے
یادِ ایامِ سلف تو نے مجھے تڑپا دیا
آہ اے چشمِ تصور تو نے کیا دکھلا دیا
اے فراقِ رفتگاں ۔ یہ تو نے کیا دکھلا دیا
دردِ پنہاں کی خلش کو اور بھی چمکا دیا
رہ گیا ہوں دونوں ہاتھوں سے کلیجہ تھام کر
کچھ مداوا اِس مرض کا اے دلِ ناکام کر

آمدِ بوئے نسیمِ گلشنِ رشکِ ارم

ہو نہ مرہونِ سماعت جس کی آوازِ قدم

لذتِ رقصِ شعاعِ آفتابِ صبحدم

یا صدائے نغمۂ مُرغِ سحر کا زیر و بم

رنگ کچھ شہرِ خموشاں میں جما سکتی نہیں

خفتگانِ کنج مرقد کو جگا سکتی نہیں

ہر گھڑی اے دل نہ یوں اشکوں کا دریا چاہیے

داستاں جیسی ہو ویسا سننے والا چاہیے

ہر کسی کے پاس یہ دکھڑا نہ رونا چاہیے

آستاں اس کو یتیم ہاشمی کا چاہیے

چشمِ باطن کی نظر بھی کیا سبک رفتار ہے

سامنے اک دم میں درگاہِ شہِ ابرار ہے

اے مددگارِ غریباں اے پناہِ بے کساں

اے نصیرِ عاجزاں اے مایۂ بے مائگاں

کارواں صبر و تحمل کا ہوا دل سے رواں

کہنے آیا ہوں میں اپنے درد و غم کی داستاں

ہے تری ذاتِ مبارک حلِ مشکل کے لیے

نام ہے تیرا شفا دُکھے ہوئے دل کے لیے

بے کسوں میں تابِ جورِ آسماں ہوتی نہیں

اِن دلوں میں طاقتِ ضبطِ فغاں ہوتی نہیں

کون وہ آفت ہے جو رہن بیاں ہوتی نہیں

اِک یتیمی ہے کہ ممنونِ زباں ہوتی نہیں

میری صورت ہی کہانی ہے دلِ ناشاد کی

ہے خموشی بھی مری سائل تری امداد کی

بزمِ عالم میں طرازِ مسندِ عظمت ہے تو

بہرِ انساں جبرئیل آیۂ رحمت ہے تو

اے دیارِ علم و حکمت قبلہ امت ہے تو

اے ضیائے چشمِ ایماں زیبِ ہر مدحت ہے تو

درد جو انساں کا تھا وہ تیرے پہلو سے اُٹھا

قلزمِ جوشِ محبت تیرے آنسو سے اُٹھا

آبِ کوثر تشنہ کامانِ محبت کا ہے تو

جس کے ہر قطرے میں سو موتی ہوں وہ دریا ہے تو

طور پر چشمِ کلیم اللہ کا تارا ہے تو

معنیِ یاسیں ہے تو۔ مفہومِ اَوْ اَدْنیٰ ہے تو

اس نے پہچانا نہ تیری ذاتِ پر انوار کو

جو نہ سمجھا احمدِ بے میم کے اسرار کو

دلربائی میں مثالِ خندۂ مادر ہے تو
مثلِ آوازِ پدر شیریں تر از کوثر ہے تو
جس سے تاجِ عرش کو زینت ہو وہ گوہر ہے تو
از پئے تقدیرِ عالم صورتِ اختر ہے تو
زیبِ حسنِ محفلِ اشرافِ عالم تو ہوا
تھی مؤخر گرچہ آمد پر مقدّم تو ہوا
تیرا رتبہ جوہرِ آئینۂ لولاک ہے
فیض سے تیرے رگِ تاکِ یقیں نمناک ہے
تیرے سایہ سے منور دیدۂ افلاک ہے
کیمیا کہتے ہیں جس کو تیرے در کی خاک ہے
تیرے نظارے کا موسیٰ میں کہاں مقدور ہے
تو ظہورِ لن ترانی گوئے اوجِ طور ہے

دوپہر کی آگ میں وقتِ درو دہقان پر

ہے پسینے سے نمایاں مہرِ تاباں کا اثر

جھلکیاں اُمید کی آتی ہیں چہرے پر نظر

کاٹ لیتا ہے مگر جس وقت محنت کا ثمر

یا محمدؐ کہہ کے اُٹھتا ہے وہ اپنے کام سے

ہائے کیا تسکیں اُسے ملتی ہے تیرے نام سے

وہ پناہِ دینِ حق وہ دامنِ غارِ حرا

جو ترے فیضِ قدم سے غیرتِ سینا ہوا

وہ حصارِ عافیت وہ سلسلہ فاران کا

جس کے ہر ذرہ سے اُٹھی دینِ کامل کی صدا

فخر پابوسی سے تیری آسماں سا ہو گئی

یہ زمیں ہم پایۂ عرشِ معلّٰی ہو گئی

نظمِ قدرت میں نشاں پیدا نہیں بیداد کا
شکوہ کرنا کام ہوتا ہے دلِ ناشاد کا
آ گرا ہوں تیرے در پر وقت ہے امداد کا
سرفرازی چاہیے بدلہ مری افتاد کا
آ نہ سکتا تھا زباں تک بے کسی کا ماجرا
حوصلہ لیکن مجھے تیری یتیمی نے دیا
تھم ذرا اے تابیٔ دل کیا صدا آتی ہے یہ
لطفِ آبِ چشمۂ حیواں کو شرماتی ہے یہ
دل کو سوزِ عشق کی آتش سے گرماتی ہے یہ
روح کو یادِ الٰہی کی طرح بھاتی ہے یہ
ہاں ادب اے دل بڑھا اعزاز مشتِ خاک کا
میں مخاطب ہوں جنابِ سیدِ لولاک کا

اے گرفتارِ یتیمی اے اسیرِ قیدِ غم

تجھ سے ہے آرامِ جانِ سیدِ خیر الامم

ناامیدی نے کیے ہیں تجھ پہ کچھ ایسے ستم

چیرتا ہے دل کو تیرا نالۂ دردو الم

تیری بے سامانیوں سے کیوں نہ میرا دل جلے

شرم سی آتی ہے تجھ کو بے نوا کہتے ہوئے

خرمنِ جاں کے لیے بجلی ترا افسانہ ہے

دل نہیں پہلو میں، تیرے غم کا عشرت خانہ ہے

جس پہ بربادی ہو صدقے وہ ترا ویرانہ ہے

سہم جائے جس سے فرحت وہ ترا کاشانہ ہے

کانپتا ہے آسماں تیرے دلِ ناشاد سے

ہل گیا عرشِ معظم بھی تری فریاد سے

خون رُلواتا ہے تیرا دیدۂ گریاں مجھے

کیوں نظر آتا ہے تو رہنِ غمِ پنہاں مجھے

کیوں نظر آتا ہے تیرا حال بے ساماں مجھے

کیوں نظر آتا ہے تو مثلِ تنِ بے جاں مجھے

میری امت کیا شریکِ دردِ پیغمبر نہیں

کیا جہاں میں عاشقانِ شافعِ محشر نہیں

جس طرح مجھ سے نبوت میں کوئی بڑھ کر نہیں

میری امت سے حمیت میں کوئی بڑھ کر نہیں

امتحانِ صدق و ہمت میں کوئی بڑھ کر نہیں

ان مسلمانوں سے غیرت میں کوئی بڑھ کر نہیں

یہ دل و جاں سے خدا کے نام پر قرباں ہیں

ہوں فرشتے بھی فدا جن پر یہ وہ انساں ہیں

جا کے یوں کہنا کہ اے گلہائے باغِ مصطفےٰ

تم سے برگشتہ نہ ہو جائے زمانے کی ہوا

عرصۂ ہستی میں از بہرِ حصولِ مدّعا

رشکِ صد اکسیر ہوتی ہے یتیموں کی دعا

یہ وہ جادو ہے کہ جس سے دیوِ حرماں دور ہو

یہ وہ نسخہ ہے کہ جس سے دردِ عصیاں دور ہو

یہ دعا میدانِ محشر میں بڑی کام آئے گی

شاہدِ شانِ کریمی سے گلے ملوائے گی

آتشِ عشقِ الٰہی سے تمہیں گرمائے گی

جو نہ موسیٰ نے بھی دیکھا تھا تمہیں دکھلائے گی

جس طرح مجھ کو شہیدِ کربلا سے پیار ہے

حق تعالیٰ کو یتیموں کی دعا سے پیار ہے

جوش میں اپنی رگِ ہمت کو لانا چاہیے

احمدی غیرت زمانے کو دکھانا چاہیے

بندشِ غم سے یتیموں کو چھڑانا چاہیے

مل کے اک دریا سخاوت کا بہانا چاہیے

کام بے دولت تہِ چرخِ کہن چلتا نہیں

نخلِ مقصد غیرِ آبِ زر کہیں پھلتا نہیں

صیدِ شاہینِ یتیمی کا پھڑکنا اور ہے

نوک جس کی دل میں چبھتی ہو وہ کانٹا اور ہے

علتِ حرماں نصیبی کا مداوا اور ہے

دردِ آزارِ مصیبت کا مسیحا اور ہے

پھونک دیتا ہے جگر کو دل کو تڑپاتا ہے یہ

نسخۂ مہر و محبت سے مگر جاتا ہے یہ

تھی یتیمی کچھ ازل سے آشنا اسلام کی

پہلے رکھی ہے یتیموں نے بنا اسلام کی

کہہ رہی ہے اہلِ دل سے ابتدا اسلام کی

ہے یتیموں پر عنایت انتہا اسلام کی

تم اگر سمجھو تو یہ سو بات کی اک بات ہے

آبرو میری یتیمی کی تمہارے ہات ہے

شکریۂ انگشتری

یہ نظم میں نے منشی سراج الدین صاحب کی بیاض سے لی ہے۔ نظم کے ساتھ حضرت علامہ رح کا گرامی نامہ بھی ہے۔ اور نظم اور گرامی نامہ دونوں خود علامہ کے قلم سے لکھے ہوئے ہیں۔ ذیل میں نظم اور خط بجنسہٖ درج کیے جاتے ہیں۔

ڈیر سراج

دو تین روز سے طبیعت بسبب دورہ درد کے علیل ہے۔ یہ چند شعر قلم برداشتہ آپ کے شکریہ میں عرض کرتا ہوں۔ میرا ارمغاں یہی ہے اسی کو قبول کر کے مجھے مشکور کیجیے۔ چاہیں تو پیشانی پر چند ادو سطور لکھ کر مخزن میں بھیج دیجیے۔ والسلام

سنہ ۱۹۰۲ء

آپ کا اقبال۔ از لاہور

آپ نے مجھ کو جو بھیجی ارمغاں انگشتری ‌ ‌ ‌ دے رہی ہے مہرِ الفت کا نشاں انگشتری

زینتِ دستِ حنا مالیدۂ جاناں ہوئی ‌ ‌ ‌ ہے مثالِ عاشقاں آتش بجاں انگشتری

تو سراپا آیتے از سورۂ قرآنِ فیض ‌ ‌ ‌ وقفِ مطلق اے سراجِ مہرباں انگشتری

میرے ہاتھوں سے اسے پہنے اگر وہ دل ربا ‌ ‌ ‌ ہو رموزِ بے دلی کی ترجماں انگشتری

ہو نہ برق افگن کہیں لے طائرِ رنگِ حنا ‌ ‌ ‌ تاکتی رہتی ہے تیرا آشیاں انگشتری

ساغرِ مے میں پڑا انگشتِ ساقی کا جو عکس ‌ ‌ ‌ بن گئی گردابۂ آبِ رواں انگشتری

ہوں بہ تبدیلِ قوافی فارسی میں نغمہ خواں ‌ ‌ ‌ ہند سے جاتی ہے سوئے اصفہاں انگشتری

یارم از کشمیر فرستادست چار انگشتری ‌ ‌ ‌ چار در صورت بمعنی صد ہزار انگشتری

چار را گر صد ہزار آوردہ ام اینک دلیل ‌ ‌ ‌ شد قبولِ دستِ یارم ہر چہار انگشتری

داغ داغ از موجِ میناکاریش جوشِ بہار ‌ ‌ ‌ می دہد چوں غنچۂ گل بوئے یار انگشتری

در لہانور* آمد و چشمِ تماشا شد تمام ‌ ‌ ‌ بود در کشمیر چشمِ انتظار انگشتری

* لاہور کا دوسرا نام جس کو امیر خسروؒ قران السعدین میں استعمال فرماتے ہیں۔ (اقبال)

یار را ساغر بکف انگشتری در دستِ یار — حلقه اش خمیازهٔ دستِ خمار انگشتری

ما اسیرِ حلقه اش او خود اسیرِ دستِ دوست — الله الله دام و صیاد و شکار انگشتری

خاتمِ دستِ سلیماں حلقه در گوشِ وے است — اے عجب انگشتری را جاں نثار انگشتری

واه چه بکشاید بدستِ آں نگارِ سیم تن — ماند گر زیں پیشتر سربسته کار انگشتری

من دلِ گم گشتهٔ خود را کجا جویم سراغ — زردی زردِ حنا را پرده دار انگشتری

راز دار دزد هم دزدِ دست در بازارِ حسن — چشمکِ دزدِ حنا را رازدار انگشتری

هر دو باهم ساختند و نقدِ دلها می برند — پخته مغز انگشتِ جاناں پخته کار انگشتری

نوبهارِ دلفریب انگشتری در دستِ یار — بوسه بر دستش زند لیل و نهار انگشتری

بوالهوس ز انگشتری طرزِ اطاعت یاد گیر — می نهد سر بر خطِ فرمانِ یار انگشتری

ماهِ نو قالب تهی کرد است از حسرت به چرخ — جلوه فرما شد چو در انگشتِ یار انگشتری

ارمغانم سلکِ گوهرهاست یعنی ایں غزل — کز سراجم نورها آمد چهار انگشتری

گشت اے اقبال مقبولِ امیرِ ملکِ حسن — کرد و ما را گره آخر ز کار انگشتری

غزل

سنہ ۱۹۰۲ عیسوی

دل کی بستی عجیب بستی ہے
لوٹنے والے کو ترستی ہے

ہو قناعت جو زندگی کا اصول
تنگدستی فراخ دستی ہے

جنس دل ہے جہان میں کمیاب
پھر بھی یہ شے غضب کی سستی ہے

تابِ اظہارِ عشق نے لے لی
گفتگو کو زباں ترستی ہے

ذکر جامِ طہور وعظ کا وعظ
مے پرستی کی مے پرستی ہے

شعر بھی اک شراب ہے اے دل
ہوشیار ہی اسی کی مستی ہے

ہم فنا ہو کے بھی فنا نہ ہوئے
نیستی اک طرح کی ہستی ہے

آنکھ کو کیا نظر نہیں آتا
ابر کی طرح سے برستی ہے

دیکھیے کیا سلوک ہو اقبال
مجرم جرم بت پرستی ہے

(منقول از مخزن)

"ماتمِ پسر"

ہمارے ایک عنایت فرما رئیس بارہ مولا علاقہ کشمیر خواجہ صمد جو صاحب ککلو ہیں انہیں چند ماہ ہوئے اپنے چہیتے اور ہونہار بیٹے کی مرگِ ناگہاں کا داغ دیکھنا نصیب ہوا خواجہ صاحب ذی علم اور علم دوست رئیس ہیں۔ اور خود زبان فارسی میں طبع شاعر ہیں۔ اور مقبل تخلص کرتے ہیں۔ مگر اس رنج نے ان کی طباعی اور زندہ دلی پر پانی پھیر دیا ہے اور انہیں تصویرِ غم بنا دیا ہے۔ شیخ محمد اقبال صاحب نے اُن کی طرف سے مرحوم کا نوحہ لکھا ہے جو درجِ ذیل ہے۔ (مخزن ۱۹۰۲ء)

اندھیرا صمد کا مکاں ہو گیا ۔۔۔ وہ خورشید روشن نہاں ہو گیا

بیاباں ہماری سرا بن گئی ۔۔۔ مسافر وطن کو رواں ہو گیا

گیا اُڑ کے وہ بلبلِ خوش نوا ۔۔۔ چمن پائمالِ خزاں ہو گیا

نہیں باغِ کشمیر میں وہ بہار ۔۔۔ نظر سے جو وہ گل نہاں ہو گیا

گیا کارواں اور ہیں راہ میں ۔۔۔ غبارِ رہِ کارواں ہو گیا

گرا اکٹ کے آنکھوں سے لختِ جگر مرے صبر کا امتحاں ہو گیا
بڑھا اور اک دشمنِ جانستاں دھواں آہ کا آسماں ہو گیا
ستم اس غضب کا خزاں نے کیا بیاباں مرا بوستاں ہو گیا
ہوئی غم کی عادت کچھ ایسی مجھے کہ غم مجھ کو آرامِ جاں ہو گیا
کسی نوجواں کی جُدائی میں قد جوانی میں مثلِ کماں ہو گیا
جُدائی میں نالاں ہوں بلبل نہ کیوں وہ گل زیبِ باغِ جناں ہو گیا
وہ سُرخی ہے اشک شفق رنگ میں حریفِ مئے ارغواں ہو گیا
بنایا تھا ڈر ڈر کے جو آشیاں وہی نذرِ برقِ تپاں ہو گیا
کروں ضبط اسے ہم نشیں کس طرح کہ ہر اشک طوفاں نشاں ہو گیا
غضب ہے غلام حسن کا فراق کہ جینا بھی مجھ کو گراں ہو گیا

دیا چُن کے وہ غم فلک نے اسے
کہ مقبل سراپا فغاں ہو گیا

"خطِ منظوم"

سنہ ۱۹۰۲ء

"پیغامِ بیعت کے جواب میں"

اِس نظم کا کچھ حصّہ "عقل و دل" کے نام سے بانگِ درا میں درج ہے۔ پوری نظم ارباب ذوق کی دلچسپی کے لیئے درج ذیل کی جاتی ہے۔

خضر سے چھپ کے مر رہا ہوں میں تشنہ کامِ مے فنا ہوں میں
ہم کلامی ہے غیریت کی دلیل خامشی پر مٹا ہوا ہوں میں
کانپ اٹھتا ہوں ذکرِ مرہم پر وہ دلِ درد آشنا ہوں میں
تنکے چن چن کے باغِ الفت کے آشیانہ بنا رہا ہوں میں
گلِ پژمردہ چمن ہوں مگر رونقِ خانۂ صبا ہوں میں
کارواں سے نکل گیا آگے مثلِ آوازۂ درا ہوں میں

دستِ واعظ سے آج بن کے نماز — کس ادا سے قضا ہوا ہوں میں

مجھ سے بیزار ہے دلِ زاہد — دیدۂ حور کی حیا ہوں میں

ہے زباں مائلِ ترانۂ شوق — سننے والے کو دیکھتا ہوں میں

میں نے مانا کہ بے عمل ہوں مگر — رمزِ وحدت سے آشنا ہوں میں

پردۂ میم میں رہے کوئی — اس بھلاوے کو جانتا ہوں میں

سب کسی کا کرم ہے یہ ورنہ — کیا مرا شوق اور کیا ہوں میں

میں کسی کو بُرا کہوں توبہ — ساری دنیا سے خود برا ہوں میں

جام ٹوٹا ہوا ہوں میں لیکن — مئے حق سے بھرا ہوا ہوں میں

ایک دانے پہ ہے نظر تیری — اور خرمن کو دیکھتا ہوں میں

تو جُدائی پہ جان دیتا ہے — وصل کی راہ سوچتا ہوں میں

بھائیوں میں بگاڑ ہو جس سے — اس عبادت کو کیا سراہوں میں

بت پرستی تو ایک مذہب ہے — کفرِ غفلت کو جانتا ہوں میں

مرگِ اغیار پر خوشی ہے تجھے
اور آنسو بہا رہا ہوں میں

میرے رونے پہ ہنس رہا ہے تو
تیرے ہنسنے کو رو رہا ہوں میں

عقل نے ایک دن یہ دل سے کہا
بھولے بھٹکوں کی رہنما ہوں میں

ہوں زمیں پر۔ گزر فلک پہ مرا
دیکھ تو کس قدر رسا ہوں میں

علم پلتا ہے میری گودی میں
رازِ ہستی سے آشنا ہوں میں

رہبری دہر میں ہے کام مرا
رشکِ خضرِ خجستہ پا ہوں میں

ہوں مفسر کتابِ ہستی کی
مظہرِ شانِ کبریا ہوں میں

تو مری ہمسری کرے تو بہ
دیدۂ کور کی ضیا ہوں میں

بوند اک خون کی ہے تو لیکن
غیرتِ لعلِ بے بہا ہوں میں

دل نے سن کر کہا کہ سب سچ ہے
پر مجھے بھی تو دیکھ کیا ہوں میں

رازِ ہستی کو تو سمجھتی ہے
اور آنکھوں سے دیکھتا ہوں میں

میرے دم سے جہان بستا ہے — اِس اندھیرے میں چاندنا ہوں میں
ہے تجھے واسطہ مظاہر سے — اور باطن کو دیکھتا ہوں میں
علم تجھ سے تو معرفت مجھ سے — تو خُدا جُو، خُدا نما ہوں میں
علم کی انتہا ہے بے چینی — اِس مرض کی مگر دوا ہوں میں
شمع تو محفلِ صداقت کی — حُسن کی بزم کا دیا ہوں میں
کِس بلندی پہ ہے مقام مرا — عرش ربِّ جلیل کا ہوں میں
گلشنِ طور میں بہار مری — قطرۂ بحر آشنا ہوں میں
تو ہے وابستۂ زمان و مکاں — اور اِس قید سے رہا ہوں میں

ہائے یہ دل ہو میرے پہلو میں — تو یہ سمجھے کہ دہریا ہوں میں
اہلِ دل کو بگاڑ سے مطلب — سب بزرگوں کی خاکِ پا ہوں میں
فیض اقبال ہے اِسی در کا — بندۂ شاہِ لافتا ہوں میں

آفتاب

سنہ ۱۹۰۲ عیسوی

شذرہ تمہیدی

یہ نظم بانگ درا میں موجود ہے لیکن اقبال کے شذرہ کے ساتھ اس نظم کو پڑھنے سے لطف اور دوبالا ہو جاتا ہے ۔ یہ نظم مع شذرہ تمہیدی مخزن میں شائع ہوئی تھی ۔

ذیل کے اشعار رگ وید کی ایک نہایت قدیم اور مشہور دعا کا ترجمہ ہیں جس کو گایتری کہتے ہیں ۔ یہ دعا اعتراف عبودیت کی صورت میں گویا اُن تاثرات کا اظہار ہے جنہوں نے نظام عالم کے حیرت ناک مظاہر کے مشاہدہ سے اول اول انسان ضعیف البنیان کے دل میں ہجوم کیا ہوگا ۔ اس قسم کی قدیم تحریروں کا مطالعہ علم ملل و نحل کے عالموں کے لیے انتہا درجہ کا ضروری ہے کیونکہ ان سے انسان کے روحانی نمو کی ابتدائی مراحل کا پتہ چلتا ہے یہی وہ دعا ہے جو چاروں ویدوں میں مشترک طور پر پائی جاتی ہے اور جس کو

برہمن اس قدر مقدس سمجھتا ہے کہ بے طہارت اور کسی کے سامنے اس کو پڑھتا تک نہیں ۔ جو لوگ محققین السنۂ شرقیہ کی تصانیف سے واقف ہیں اُن کو معلوم ہے کہ سر ولیم جونس مرحوم کو اس دعا کے معلوم کرنے میں کس قدر تکلیف اور محنت برداشت کرنی پڑی تھی ۔ مغربی زبانوں میں اس کے بہت سے ترجمے کیے گئے ہیں۔ لیکن حق یہ ہے کہ زبان سنسکرت کی نحوی پیچیدگیوں کی وجہ سے السنۂ حال میں وضاحت کے ساتھ اس کا مفہوم ادا کرنا نہایت مشکل ہے ۔ اس مقام پر یہ ظاہر کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اصل سنسکرت میں لفظ "سوتر" استعمال کیا گیا ہے جس کے لیے اُردو لفظ نہ مل سکنے کے باعث ہم نے لفظ آفتاب رکھا ہے لیکن اصل میں اس لفظ سے مراد اس آفتاب کی ہے جو فوق المحسوسات ہے اور جس سے یہ مادی آفتاب کسب ضیا کرتا ہے ۔ اکثر قدیم قوموں نے اور نیز صوفیا نے اللہ تعالیٰ کی ہستی کو نور سے تعبیر کیا ہے ۔ قرآن شریف میں آیا ہے "اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" اور شیخ محی الدین ابن عربی فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ ایک نور ہے جس سے تمام چیزیں نظر آتی ہیں

لیکن وہ خود نظر نہیں آتا۔ علیٰ ہذا القیاس افلاطونِ الٰہی کے مصری پیروؤں اور ایران کے قدیم انبیا کا بھی یہی مذہب تھا۔ ترجمہ کی مشکلات سے ہر شخص واقف ہے لیکن اِس خاص صورت میں دقت اَور بھی بڑھ گئی ہے کیونکہ اصل الفاظ کی آواز موسیقیت اور وہ طمانیت آمیز اثر جو ان کے پڑھنے سے دل پر ہوتا ہے اُردو زبان میں منتقل نہیں ہو سکتا۔ گایتری کے مصنف نے ملک الشعراء ٹنی سن کی طرح اپنے اشعار میں ایسے الفاظ استعمال کیے ہیں جن میں حروفِ علّت اور صحیح کی قدرتی ترتیب سے ایک ایسی لطیف موسیقیت پیدا ہو جاتی ہے جس کا غیر زبان میں منتقل کرنا ناممکنات بس سے ہے۔ اِس مجبوری کی وجہ سے میں نے اپنے ترجمہ کی بنیاد اس سوکت (گفتار زیبا) پر رکھی ہے جس کو سوریا نرائن اپنشد میں گایتری مذکور کی شرح کے طور پر لکھا گیا ہے۔ ترجمہ کرنے کو تو میں نے کر دیا ہے مگر مجھے اندیشہ ہے کہ سنسکرت داں اصحاب اس پر وہی رائے قائم کریں گے جو جیپ مین نے پوپ کا ترجمۂ ہومر پڑھ کر قائم کی تھی۔ یعنی شعر تو خاصے ہیں لیکن یہ گایتری

نہیں ہے۔

محمد اقبال

اے آفتاب روح و روانِ جہاں ہے تو
شیرازہ بندِ دفترِ کون و مکاں ہے تو

باعث ہے تو وجود و عدم کی نمود کا
ہے سبز تیرے دم سے چمن ہست و بود کا

قائم یہ عنصروں کا تماشا تجھی سے ہے
ہر شے میں زندگی کا تقاضا تجھی سے ہے

ہر شے کو تیری جلوہ گری سے ثبات ہے
تیری نگاہ رشتۂ تارِ حیات ہے

وہ آفتاب جس سے زمانے میں نور ہے
دل ہے خرد ہے روح رواں ہے شعور ہے

اے آفتاب ہم کو ضیائے شعور دے
چشمِ خرد کو اپنی تجلّی سے نور دے

ہے محفلِ وجود کا ساماں طراز تو
یزدانِ* ساکنانِ نشیب و فراز تو

تیرا کمال ہستی ہر جاندار میں
تیری نمود سلسلۂ کوہسار میں

* یزدان کو قدیم حکمائے ایران اصل نور تصور کرتے ہیں ۔ اِس واسطے خالق کی جگہ یہ لفظ استعمال کیا گیا۔

ہر چیز کی حیات کا پرورگار تو زائیدگانِ* نور کا ہے تاجدار تو

نے ابتدا کوئی نہ کوئی انتہا تری

آزاد قید اول و آخر ضیا تری

* یعنی دیوتا ۔ سنسکرت میں لفظ دیوتا کے معنی زائیدۂ نور کے ہیں یعنی ایسی ہستی جس کی پیدائش نور سے ہوئی ہو ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم ہندو دیوتاؤں کو دیگر مخلوقات کی طرح مخلوق تصور کرتے تھے ازلی نہیں سمجھتے تھے ۔ غالباً ان کا مفہوم وہی ہوگا جس کو ہم لفظ فرشتہ سے تعبیر کرتے ہیں کیونکہ فرشتوں کا وجود بھی نوری تسلیم کیا گیا ہے اگرچہ ان کو مخلوق مانا گیا ہے پس ہندو مذہب کو شرک کا مجرم گردانتا میرے نزدیک صحیح معلوم نہیں ہوتا ۔

(اقبال)

غزل

(۱۹۰۳ء عیسوی)

چند روز ہوئے سیالکوٹ میں ایک تقریب تھی یعنی وہاں کے رئیس اعظم آغا محمد باقر خاں صاحب قزلباش کے فرزند ارجمند محمد نادر کے ختنہ کے غسل صحت کی شادی منائی گئی تھی۔ وہاں شیخ محمد اقبال صاحب بھی مدعو تھے کسی نے ایک مصرعہ طرح دیا جس پر یہ غزل ہوئی۔ اور اس غزل کو انہوں نے اپنے دوست کے بیٹے کی اس تقریب سعید کا سہرا قرار دیا۔ چنانچہ اس کی طرف مقطع میں اشارہ ہے۔ (مخزن)

لڑکپن کے ہیں دن صورت کسی کی بھولی بھولی ہے
زباں میٹھی ہے لب ہنستے ہیں پیاری پیاری بولی ہے

ترا اے سیل دریائے محبت منہ تکوں کب تک
مری کشتی جو تھی آپ اپنے ہاتھوں سے ڈبو لی ہے

کوئی شوخی تو دیکھے جب ذرا رونا تھما میرا
کہا بے درد نے "کیوں آپ نے مالا پرو لی ہے

جفا جو کہہ دیا میں نے مگر تم نے بُرا مانا
خفا کیوں ہو گئے یہ عاشقوں کی بولی ٹھولی ہے

شب فرقت تصور تھا مرا اعجاز تھا کیا تھا
تری تصویر کو میں نے بلایا ہے تو بولی ہے

وہ میری جستجو میں پھر رہے ہیں خیر ہو یارب
پتا میرا بتانے کو قیامت ساتھ ہو لی ہے

تماشائی کوئی آئینہ ہستی میں ہے اپنا
مزا ہے حسن نے اے دل کتاب عشق کھولی ہے

سمجھ سکتا نہ تھا کوئی مجھے اس بزم ہستی میں
گرہ تھی زندگی میری اجل نے آ کے کھولی ہے

جگت ایشر ہے تو ہر آتما کو پیت ہے تیری
صنم خانہ کی یارب کیسی پیاری پیاری بولی ہے

ہمیں یادِ وطن کیا پیش آتا ہے خدا جانے
بھلا تو کس لیے غربت زدوں کے ساتھ ہولی ہے

تغیرِ روز کا کچھ دید کے قابل نہ تھا نرگس
بتا پھر کس کے نظارے کو تو نے آنکھ کھولی ہے

تبسمِ چاکِ جیبِ گل، ترنم، نالۂ بلبل
یہ بے مہروں کی باتیں ہیں یہ بے دردوں کی بولی ہے

مہ و خورشید و انجم دوڑتے ہیں ساتھ اس کے
فلک کیا ہے کسی معشوق بے پروا کی ڈولی ہے

یہ ہو گی شوخ اے صیاد مدت کی اسیری سے
نیا قیدی ہوں میں آواز میری بھولی بھولی ہے

لہو کی بوندیاں لالے کی کلیاں بن کے پھوٹی ہیں
مگر زیر زمیں کھیلی ترے کشتوں نے ہولی ہے

دیارِ عشق میں واماندگی رفتار ہے اے دل
جسے کہتے ہیں خاموشی وہ اس بستی کی بولی ہے

گماں تجھ پر ہوا تھا کیا دلِ بلبل کی چوری کا
صبا نے غنچۂ گل! کیوں گرہ تیری ٹٹولی ہے

گل مضموں سے اے اقبالؔ یہ سہرا ہے ناصر کا
غزل میری نہیں ہے یہ کسی گلچیں کی جھولی ہے

عرض بہ جناب حضرت نظام الدین اولیاؒ

یہ نظم علامہ مرحوم نے اس وقت لکھی تھی جب ان کے برادر محترم شیخ عطا محمد صاحب بدقسمتی سے ایک مصیبت میں مبتلا ہو گئے تھے۔ علامہ نے یہ نظم لکھ کر کسی دوست کے ہمراہ دہلی درگاہِ حضرت نظام الدین اولیاؒ میں بھجوائی تھی۔ فضل ایزدی سے جلد شیخ صاحب مرحوم کو مصیبت سے رہائی ہوئی۔

کیوں نہ ہوں ارماں مرے دل میں کلیم اللہ کے
طور در آغوش ہیں ذرے تری درگاہ کے

میں تری درگاہ کی جانب جو نکلا، لے اُڑا
آسماں تارے بنا کر میری گردِ راہ کے

ہے زیارت کی تمنا، المدد اے سوزِ عشق
پھول لا دے مجھ کو گلزارِ خلیل اللہ کے

شانِ محبوبی ہوئی ہے، پردہ دارِ شانِ عشق
واہ کیا رُتبے ہیں اِس سرکارِ عالی جاہ کے

تر جو تیرے آستانے کی تمنا میں ہوئی
اشک موتی بن گئے چشمِ تماشا خواہ کے

رنگ اس درگہ کے ہر ذرّے میں ہے توحید کا
طائرانِ بام بھی طائر ہیں بسم اللہ کے

چھپ کے ہے بیٹھا ہوا اثباتِ نفیِ غیر میں
لا کے دریا میں نہاں موتی ہیں اِلّا اللہ کے

سنگِ اسود تھا مگر سنگِ فسانِ تیغِ عشق
زخم میرے کیا ہیں دروازے ہیں بیت اللہ کے

عشق اس کو بھی نہ تھی درگاہ کی رفعت سے ہے
آہ! یہ انجم نہیں آنسو ہیں چشمِ ماہ کے

تیرے ناخن نے جو کھولی میمِ احمد کی گرہ
کھل گئے عقدے جہاں ہیں ہر خدا آگاہ کے

میرے جیسے بے نواؤں کا بھلا مذکور کیا
قیصر و فغفور ہیں درباں تری درگاہ کے

محوِ اظہارِ تمنائے دلِ ناکام ہوں
لاج رکھ لینا کہ میں اقبال کا ہم نام ہوں

ہمی پھرتی ہے شفا میرے دلِ بیمار سے
اے مسیحا دم! بچا لے مجھ کو اس آزار سے

اے ضیائے چشمِ عرفاں، اے چراغِ راہِ عشق
تنگ آیا ہوں جفائے چرخِ ناہنجار سے

سینۂ پاکِ علی جن کا امانت دار تھا
اے شہِ ذی جاہ! تو واقف ہے اُن اسرار سے

ہند کا داتا ہے تو تیرا بڑا دربار ہے
کچھ ملے مجھ کو بھی اِس دربارِ گوہر بار سے

اِک نظر میں خسرو ملکِ سخن خسرو ہوا
میں کہیں خالی نہ پھر جاؤں تری سرکار سے

تاک میں بیٹھی ہے بجلی میرے حاصل کے لیے
بیر ہے بادِ بہاری کو مرے گلزار سے

آج کل اصغر جو تھے اکبر ہیں اور مولا غلام
ہیں مجھے شکوے ہزاروں چرخِ کج رفتار سے

کیا کروں اوروں کا شکوہ، اے امیرِ ملکِ فقر!
دشمنی میں بڑھ گئے اہلِ وطن اغیار سے

کہہ رہے ہیں مجھ کو پر بستہ قفس میں دیکھ کر
اُڑ نہ جائے یہ کہیں پر کھول کر منقار سے

گریۂ شبنم پہ گل ہنستے ہیں کیا بیدرد ہیں
وہ جو تھی بوئے محبت اُڑ گئی گلزار سے

گھات میں صیاد، مائل آشیاں سوزی پہ برق
باغ بھی بگڑا ہوا ہے عندلیبِ زار سے

کہہ دیا تنگ آکے اتنا بھی کہ میں مجبور تھا
خامشی ممکن نہیں خو کردۂ گفتار سے

سخت ہے میری مصیبت سخت گھبرایا ہوں میں
بن کے فریادی تری سرکار میں آیا ہوں میں

کیمیا سے بھی فزوں ہے تیری خاکِ در سب مجھے
ہاں عطا کر دے مرے مقصود کا گوہر مجھے

تو ہے محبوبِ الٰہی کر دعا میرے لیئے
یہ مصیبت ہے مثالِ فتنۂ محشر مجھے

ہو اگر یوسف مرا زحمت کشِ چاہِ الم
چین آئے مصر آزادی میں پھر کیونکر مجھے

اُس بڑی سرکار کے قابل مری فریاد ہے
چل حضوری میں شہِ یثرب کی تو لے کر مجھے

میرا کیا منہ ہے کہ اُس سرکار میں جاؤں مگر
تیرے جیسا مل گیا تقدیر سے رہبر مجھے

واسطہ دوں گا اگر لختِ دلِ زہرا کا میں
غم میں کیونکر چھوڑ دیں گے شافعِ محشر مجھے

رونے والا ہوں شہیدِ کربلا کے غم میں میں
کیا دُرِ مقصد نہ دیں گے ساقیِ کوثر مجھے

دل میں ہے مجھ بے عمل کے داغِ عشقِ اہلِ بیت
ڈھونڈتا پھرتا ہے ظلِ دامنِ حیدر مجھے

جا ہی پہنچے کی صدا پنجاب سے دہلی تلک

کر دیا ہے گرچہ اس غم نے بہت لاغر مجھے

آہ! تیرے سامنے آنے کے نا قابل ہوں میں

مُنہ چھپا کر مانگتا ہوں تجھ سے وہ سائل ہوں میں

دربارِ بہاول پُور

(سنہ ۱۹۰۳ عیسوی)

ماہِ رواں میں چند روز سرزمین بہاول پور نے ایسے دیکھے ہیں جن پر وہ تا دیر ناز کرے گی۔ رعایائے بہاول پور کی مخلصانہ دعائیں کامیاب ہوئیں نخلِ تمنا ہرا ہوا۔ اور شاخِ آرزو پھل لائی یعنی حضور پرنور رکن الدولہ۔ نصرت جنگ مخلص الدولہ۔ حافظ الملک ہز ہائینس نواب محمد بہاول خاں پنجم عباسی کو ہز ایکسلنسی والسرائے و گورنر جنرل

بہادر کشورِ ہند نے خود اپنے ہاتھوں سے مسندِ سلطنت پر بٹھایا اور زمامِ اختیارات ان کے ہاتھ میں دی۔ اس خوشی کی تقریب میں جو جشن ریاست میں منایا گیا وہ مدتوں یادگار رہے گا۔ زمین بہاول پور ۲۱ر نومبر کی شام کو کثرتِ چراغاں سے رشکِ آسماں بن رہی تھی۔ اور سارا شہر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ایک سجی ہوئی دلہن۔ ہجوم خلائق ایسا کہ معلوم ہو آبادی گردونواح میں کہیں باقی ہی نہیں رہی۔ سب کھنچکر بہاول پور میں آگئی ہے۔ رؤسائے عالی تبار اور راجگانِ ذی شان کے علاوہ دیگر معزز مہمان جو ہر فرقے اور ہر طبقے کے منتخب لوگوں میں تھے اور ملک کے ہر گوشے سے آئے ہوئے تھے زینتِ تقریب کو دوبالا کر رہے تھے۔ انگریز حکام کی بھی ایک معقول تعداد رونق بخش جلسہ تھی۔ اس مبارک تقریب پر شیخ محمد اقبال صاحب ایم۔ اے سے ایک قصیدہ کہنے کی فرمائش کی گئی تھی۔ اور انہیں مدعو بھی کیا گیا تھا۔ مگر فرضِ منصبی سے رخصت نہ ملنے کی وجہ سے وہ جانے سے معذور رہے اور قلتِ فرصت سے قصیدہ بھی بعد میں مکمل ہوا۔ اس لیے ہم اُسے ان ناچیز

اوراق کے ذریعہ سے بندگانِ عالی تک پہنچاتے ہیں۔ صاحبانِ فن دیکھیں گے کہ قصیدہ کی زمین کس قدر مشکل تھی مگر اس میں کیسے کیسے شعر طبعِ خداداد کے زور سے شاعر نے نکالے ہیں۔ اور پرانے اور نئے رنگ کو کس خوبی سے ملایا ہے۔ چونکہ اب کے حصۂ نظم پہلے لکھا جا چکا ہے اور ادھر نثر میں چند صفحوں کی گنجائش ہے اور اس قصیدہ کا اسی مہینے میں شائع ہونا موزوں معلوم ہوتا ہے اس واسطے نثر کے حصّے میں اس قصیدہ کو جگہ دیتے ہیں۔

عبدالقادر

بزمِ انجم میں ہے گو چھوٹا سا اِک اختر زمیں
آج رفعت میں ثریّا سے بھی ہے اوپر زمیں
اوج میں بالا فلک سے مہر سے تنویر میں
کیا نصیبہ ہے رہی ہر معرکہ میں در زمیں

انتہائے نور سے ہر ذرہ اختر خیز ہے
مہر و ماہ و مشتری صیغے ہیں اور مصدر زمیں

لے کے پیغامِ طرب جاتی ہے سوئے آسماں
اب نہ ٹھہرے گی کبھی اطلس کے شانوں پر زمیں

شوق بک جانے کا ہے فیروزہ گردوں کو بھی
مول لیتی ہے لٹانے کے لیے گوہر زمیں

بسکہ گلشن ریز ہے ہر قطرۂ ابرِ بہار
ہے شگفتہ صورتِ طبعِ سخن گستر زمیں

برگِ گل کی رگ میں ہے جنبش رگِ جاں کی طرح
ہے ایں اعجازِ عیسیٰ کی کہ افسوں گر زمیں

خاک پر کھینچیں جو نقشہ مُرغِ بسم اللہ کا
قوّتِ پرواز دے حرفِ قُم کہہ کر زمیں

صاف آتا ہے نظر صحن چمن میں عکسِ گل
بن گئی آپ اپنے آئینے کی روشن گر زمیں

اس قدر نظارہ پرور ہے کہ نرگس کے عوض
خاک سے کرتی ہے پیدا چشم اسکندر زمیں

امتحاں ہو اس کی وسعت کا جو مقصودِ چمن
خواب میں سبزے کے آئے آسماں بن کر زمیں

چاندنی کے پھول پر ہے ماہ کامل کا سماں
دن کو ہے اوڑھے ہوئے مہتاب کی چادر زمیں

آسماں کہتا ہے ظلمت کا جو ہو دامن میں داغ
دھووے پانی چشمۂ خورشید سے لے کر زمیں

چومتی ہے دیکھنا جوشِ عقیدت کا کمال
پائے تختِ یادگارِ عصمتِ پیغمبر زمیں

زینتِ مسند ہوا عبّاسیوں کا آفتاب

ہو گئی آزاد احسانِ شہِ خاور زمیں

یعنی نواب بہادل خاں۔ کرے جس پر فدا

بحر موتی۔ آسماں انجم۔ زر و گوہر زمیں

جس کے بدخواہوں کی شمعِ آرزو کے واسطے

رکھتی ہے آغوش میں صد موجۂ صرصر زمیں

جس کی بزم مسند آرائی کے نظارے کو آج

دل کے آئینہ سے لائی دیدۂ جوہر زمیں

فیض نقش پا سے جس کے ہے وہ جاں بخشی کا ذوق

شمع سے لیتی ہے پروانے کی خاکستر زمیں

جس کی راہ آستاں کو حق نے وہ رتبہ دیا

کہکشاں اس کو سمجھتا ہے فلک۔ محور زمیں

آستانہ جس کا ہے اس قوم کی سجدہ گاہ

تھی کبھی جس قوم کے آگے جبیں گستر زمیں

جس کے فیض پا سے ہے شفاف مثلِ آئینہ

چشمِ اعدا میں چھپا کر خاک کا عنصر زمیں

جس کے ثانی کو نہ دیکھے مدتوں ڈھونڈے اگر

ہاتھ میں لے کر چراغ لالۂ احمر زمیں

وہ سراپا نور اک مطلع خطابیہ پڑھوں

جس کے ہر مصرع کو سمجھے مطلع خاور زمیں

اے کہ فیض نقشِ پا سے تیرے گل بر سر زمیں

اے کہ تیرے دم قدم سے خسرو۔ خاور زمیں

اے کہ تیرے آستاں سے آسماں انجم بجیب

اے کہ ہے تیرے کرم سے معدنِ گوہر زمیں

لے کے آئی ہے برائے خطبۂ نام سعید
چوب نخلِ طور سے ترشا ہوا منبر زمیں

تیری رفعت سے جو یہ حیرت میں ہے ڈوبا ہوا
جانتی ہے مِہر کو اک مُہرۂ ششدر زمیں

ہے سراپا طور عکسِ رائے روشن سے ترے
ورنہ تھی بے نور مثلِ دیدۂ عبہر زمیں

مایۂ نازش ہے تو اس خانداں کے واسطے
اب تلک رکھتی ہے جس کی داستاں از بر زمیں

ہو ترا عہدِ مبارک صبحِ حکمت کی نمود
وہ چمک پائے کہ ہو محسودِ ہر اختر زمیں

سامنے آنکھوں کے پھر جائے سماں بغداد کا
ہند میں پیدا ہو پھر عبّاسیوں کی سرزمیں

محو کر دے عدل تیرا آسماں کی کجروی

کلیاتِ دہر کے حق میں بنے مسطر زمیں

صلح ہو ایسی گلے مل جائیں ناقوس و اذاں

ساتھ مسجد کے رکھے بُت خانۂ آزر زمیں

نام شاہنشاہِ اکبر زندۂ جاوید ہے

ورنہ دامن میں لیے بیٹھی ہے سو قیصر زمیں

بادشاہوں کی عبادت ہے رعیّت پروری

ہے اسی اخلاص کے سجدے سے قائم ہر زمیں

ہے مروّت کی صدف میں گوہرِ تسخیرِ دل

یہ گہر وہ ہے کرے جس پر فدا کشور زمیں

حکمراں مستِ شرابِ عیش و عشرت ہو اگر

آسماں کی طرح ہوتی ہے ستم پرور زمیں

عدل ہو مالی اگر اس کا یہی فردوس ہے

ورنہ ہے مٹی کا ڈھیلا خاک کا پیکر زمیں

ہے گل و گلزار محنت کے عرق سے سلطنت

ہو نہ یہ پانی تو پھر سرسبز ہو کیونکر زمیں

چاہیے پہرا دماغ عاقبت اندیش کا

بے دری میں ہے مثالِ گنبدِ اخضر زمیں

لامکاں تک کیوں نہ جائے گی دعا اقبالؔ کی

عرش تک پہنچی ہے جس کے شعر کی اُڑ کر زمیں

خانداں تیرا رہے زیبندۂ تاج و سریر

جب تلک مثلِ قمر کھاتی رہے چکّر زمیں

مسندِ احباب رفعت سے ثریّا بوس ہو

خاکِ رختِ خواب ہو اعدا کا اور بستر زمیں

تیرے دشمن کو اگر شوقِ گل و گلزار ہو

باغ میں سبزے کی جا پیدا کرے نشتر زمیں

ہو اگر پنہاں تری ہیبت سے ڈر کر زیرِ خاک

مانگ کر لائے شعاعِ مہر سے خنجر زمیں

پاک ہے گردِ غرض سے آئینہ اشعار کا

جو فلک رفعت میں ہو لایا ہوں وہ چُن کر زمیں

تھی تو پتھر ہی مگر مدحت سرا کے واسطے

ہو گئی ہے گل کی پتی سے بھی نازک تر زمیں

اہلِ درد

(۱۹۰۳ سنہ عیسوی)

چند روز ہوئے اقبال، گرامی اور بسمل تینوں حضرات ایک مجلس میں تشریف رکھتے تھے صاحب خانہ نے جو نوازش نام اور تخلص رکھتے تھے ایک مصرعہ برولیف "اہلِ درد" پڑھا۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اقبال نے بیان کیا تھا کہ انہیں درد قولنج کی شکایت ہے اور اس وقت اس کے آغاز کے آثار معلوم ہوتے تھے۔ اس پر غزل گوئی کی فرمائش ہوئی۔ اور اقبال نے بحالتِ درد مندرجہ ذیل دو غزلیں اس زمین میں کہیں مولوی عبداللہ صاحب بسمل ایک فارسی قطعہ تمہیداً ان کے ساتھ لکھ کر انہیں بغرضِ اشاعت بھیجتے ہیں۔

زندگی دنیا کی مرگِ ناگہانِ اہلِ درد

موت پیغامِ حیاتِ جاودانِ اہلِ درد

بند ہو کر اَور کھلتی ہے زبانِ اہلِ درد
بولتا ہے مشل نے ہر استخوانِ اہلِ درد

آپ بائع آپ ہی نقد و متاع و مشتری
ساری دنیا سے نرالی ہے دکانِ اہلِ درد

اس خموشی اور گویائی کے صدقے جائیے
محو شکر بے زبانی ہے زبانِ اہلِ درد

بیخودی میں یہ پہنچ جاتے ہیں اپنے آپ تک
عین بیداری نہ ہو خوابِ گرانِ اہلِ درد

کہہ رہی ہے ہر کلی گلزارِ ابراہیم کی
آگ سے ہوتا ہے پیدا گلستانِ اہلِ درد

پالیا موسیٰ نے آخر بندۂ اللہ کو
درد والوں ہی کو ملتا ہے نشانِ اہلِ درد

ان کی دنیا بھی یہی عرشِ معلیٰ بھی یہی
دل مکانِ اہلِ درد و لامکان اہلِ درد

ہائے کیا محشر یہ واعظ نے اُٹھا رکھی ہے بات
ہے اِسی دنیا میں ہوتا امتحانِ اہلِ درد

درد ہی کے دم سے ہے ان دل جلوں کی زندگی
درد سے پیدا ہوئی روحِ روانِ اہلِ درد

یہ اُجڑ جانے کو آبادی سمجھتے ہیں مگر
ڈھونڈتا ہے راہزن کو کاروانِ اہلِ درد

ارتجالاً ہم نے اے اقبالؔ کہہ ڈالے یہ شعر
تھی نوازش کو جو فکرِ امتحانِ اہلِ درد

دیگر

صبرِ ایوب و فا خو جزوِ جانِ اہلِ درد

گریۂ آدم سرشتِ دودمانِ اہلِ درد

ہے سکوں نا آشنا طبعِ جہانِ اہلِ درد

جوں قمر سائر ہے قطبِ آسمانِ اہلِ درد

اوج یک مشتِ غبارِ آستانِ اہلِ درد

جوہرِ رفعت بلا گردانِ شانِ اہلِ درد

پھر رہے ہیں گلشنِ ہستی کے نظاروں میں مست

نکہتِ گل ہے شرابِ ارغوانِ اہلِ درد

ابتدا میں شرحِ رمز آیۂ لَا تَقْرَبَا

کس قدر مشکل تھا پہلا امتحانِ اہلِ درد

ہم نشیں رونا ہمارا کچھ نیا رونا نہیں

تھی ہم آہنگ ندائے کن فغانِ اہل درد

شورشِ محشر جسے واعظ نے ہے سمجھا ہوا

ہے وہ گلبانگِ درائے کاروانِ اہل درد

بت کدے کی سمت کیوں جاتا ہے یارب برہمن

کعبۂ دل ہی تو ہے ہندوستانِ اہل درد

گرمیِ جوشِ عقیدت سے کیا کرتی ہے طوف

کعبۂ برقِ بلا ہے آشیانِ اہل درد

ذبح ہونا کوچۂ الفت میں ہے ان کی منز

ہے صدا تکبیر کی گویا اذانِ اہل درد

دار پر چڑھنا نہ تھا معراج تھا منصور کو

تھی وہ سولی درحقیقت نردبانِ اہلِ درد

موجِ خونِ سرمد و تبریزی و منصور سے
کس قدر رنگیں ہے یارب داستانِ اہلِ درد

تو نے اے انسانِ غافل آہ کچھ پروا نہ کی
بے زباں طائر سمجھتے تھے زبانِ اہلِ درد

دیدۂ سوزن سے بھی رکھتے ہیں یہ پنہاں اسے
کوئی کیا دیکھے گا زخمِ بے نشانِ اہلِ درد

دیکھنے والے سمجھتے تھے دمِ عیسیٰ جسے
تھی وہ اک موجِ نسیمِ بوستانِ اہلِ درد

پھرتے رہتے ہیں میان کوچۂ حبل الورید
ہے اسی آوارگی میں عز و شانِ اہلِ درد

کہہ دیا اقبال اک مصرعِ نوازش نے جو آج
وہ بہانہ ہو گیا بہرِ بیانِ اہلِ درد

سپاسِ جنابِ امیرؑ

ذیل کی نظم درج کرکے آج ہم ان احباب کے تقاضوں سے سبکدوش ہوتے ہیں جو پروفیسر اقبال صاحب کے فارسی کلام کے لیے اکثر دفعہ اشتیاق ظاہر کیا کرتے ہیں۔ فارسی نظمیں عموماً مخزن میں درج نہیں ہوتیں تاہم احباب کے اصرار سے ہم اسے ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔ یہی نظم باظہارِ عقیدت شیخ صاحب صبح کے وقت پڑھا کرتے ہیں۔

اے محوِ ثنائے تو زبانہا　　اے یوسفِ کاروانِ جانہا

اے بابِ مدینۂ محبت　　اے نوحِ سفینۂ محبت

اے ماحیِ نقشِ باطلِ من　　اے فاتحِ خیبرِ دلِ من

اے سِرِّ خطِ وجوب و امکاں　　تفسیرِ تو سورہ ہائے قرآں

اے مذہبِ عشق را نمازے　　اے سینۂ تو امینِ رازے

اے رہبرِ نبوّتِ محمدؐ ۔ اے وصفِ تو مدحتِ محمدؐ

گردوں کہ بہ رفعت ایستادست ۔ از بامِ بلندِ تو فتادست

ہر ذرہ درگہت چو منصور ۔ در جوش ترانہ انا الطور

بے تو نتواں باو رسیدن ۔ بے او نتواں بتو رسیدن

فردوس ز تو چمن در آغوش ۔ از شانِ تو حیرت آئنہ پوش

جانم بغلامیِ تو خوشتر ۔ سر بر زدہ ام ز جیبِ قنبر

ہشیارم و مست بادۂ تو ۔ چوں سایہ ز پا فتادۂ تو

از ہوش شدم مگر بہوشم ۔ گوئی کہ نصیریِ خموشم

دانم کہ ادب بضبطِ راز است ۔ در پردۂ خامشی نیاز است

اما چہ کنم مئے تولا ۔ تند است بروں فتد ز مینا

ز اندیشۂ عاقبت رہیدم

جنسِ غمِ آلِ تو خریدم

فکرم چو بہ جستجو قدم زد — در دیر شد و در حرم زد

در دشتِ طلب بسے دویدم — دامان چو گرد باد چیدم

در آبلہ خارہا خلیدہ — صد لالہ ترِ قدم دمیدہ

افتادہ گرہ بروے کارم — شرمندۂ دامنِ غبارم

پویاں پئے خضر سوئے منزل — بر دوشِ خیال بستہ محمل

جویائے مے و شکستہ جامے — چوں صبح بباد چیدہ دامے

پیچیدہ بخود چو موجِ دریا — آوارہ چو گرد بادِ صحرا

واماندہ ز دردِ نارسیدن — در آبلہ شکستہ دامن

عشق تو دلم ربود ناگاہ — از کار گرہ کشود ناگاہ

آگاہ ز ہستی و عدم ساخت — بُت خانۂ عقل را حرم ساخت

چوں برق بخرمنم گزر کرد — از لذتِ سوختن خبر کرد

برباد متاعِ ہستیم داد — جامے ز مے حقیقتم داد

سرمست شدم ز پا فتادم • چوں عکس ز خود جدا فتادم

پیراہن ماو من دریدم چوں اشک ز چشم خود چکیدم

خاکم بفرازِ عرش بُردی زاں راز کہ با دلم سپردی

وصل بکنار گشتیم شد طوفانِ جمال زشتیم شد

جز عشق حکایتے ندارم پروائے ملامتے ندارم

از جلوۂ عام بے نیازم

سوزم۔ گریم۔ تپم۔ گدازم

منقول از مخزن

جنوری ۱۹۰۵ عیسوی

مدینے کے کبوتر کی یاد

یہ نظم کلیات اقبال میں ہے۔ اور محمد ذکی صاحب ابن شمس العلما مولانا میر حسن نے بھی ایک بار اس کا ذکر کیا تھا۔

رحمت ہو تیری جان پہ اے مرغِ نامہ بر | آیا تھا اُڑ کے ذروۂ بامِ حرم سے تو
پرواز جبرئیل تھی تیری اُڑان میں | کرتا نہ کیوں حدوث کو پیدا قدم سے تو
زمزم میں تر ہوئی تیری منقارِ نغمہ ریز | کرتا رہا عرب کو نمایاں عجم سے تو
جاں کو بسا دیا تھا شمیمِ حجاز میں | لایا تھا تار توڑ کے زلفِ صنم سے تو
ہم کو دیا پیام الف، لام، میم کا | نا آشنا نہ تھا رہِ رسمِ الم سے تو
نفرت ہی آشیانۂ ہستی سے تھی تو کیوں | آیا اتر کے طارمِ کاخِ عدم سے تو
تجھ پر ابوہریرہؓ بھی قربان ہوں کہ تھا | وابستگانِ دامنِ فخر الامم سے تو
شاید انہیں کی آہ میں تو ہو گیا نشانہ | گر بچ سکا نہ گریہ کی مشقِ ستم سے تو

قطعہ

موت کی ظلمت میں ہے پنہاں شرابِ زندگی
مر گیا ہوں یوں تو ہیں لیکن فنا کیونکہ ہوا
یوں تو مرتے ہو ہنسی ٹھٹھے پہ اے اقبال تم
دل تمہارا اس قدر درد آشنا کیونکہ ہوا

(سنہ ۱۹۰۳ء)

نعت

نگاہ عاشق کی دیکھ لیتی ہے پردۂ میم کو اُٹھا کر
وہ بزمِ یثرب میں آ کے بیٹھیں ہزار منہ کو چھپا چھپا کر

جو تیرے کوچہ کے ساکنوں کا فضائے جنت میں دل نہ بہلا

تسلیاں دے رہی ہیں حوریں خوشامدوں سے منا منا کر

بہارِ جنت کو کھینچتا تھا ہمیں مدینہ سے آج رضواں

ہزار مشکل سے اس کو ٹالا بڑے بہانے بنا بنا کر

لحد میں سوئے ہیں تیرے شیدا تو حورِ جنت کو اس میں کیا ہے

کہ شورِ محشر کو بھیجتی ہے خبر نہیں کیا سکھا سکھا کر

تری جدائی میں خاک ہونا اثر دکھاتا ہے کیمیا کا

دیارِ یثرب میں آ ہی پہنچے صبا کی موجوں میں مل ملا کر

شہیدِ عشقِ نبی کے مرنے میں بانکپن بھی ہیں سو طرح کے

اجل بھی کہتی ہے زندہ باشی ہمارے مرنے پہ زہر کھا کر

رکھی ہوئی کام آ ہی جاتی ہے جنسِ عصیاں عجیب شے ہے

کوئی اسے پوچھتا پھرے ہے دُرِ شفاعت دکھا دکھا کر

ترے ثنا کو عدو ہیں رحمت سے چھیڑ کرتے ہیں روزِ محشر
کہ اس کو پیچھے لگا لیا ہے گناہ اپنے دکھا دکھا کر

کرے کوئی کیا کہ تاڑ لیتی ہے لاکھ پردوں میں بھی شفاعت
رکھے تھے ہم نے گناہ اپنے ترے غضب سے چھپا چھپا کر

بتائے دیتے ہیں اے صبا ہم یہ گلستانِ عرب کی بو ہے
مکر نہ اب ہاتھ لا ادھر کو وہیں سے لائی ہے تو اڑا کر

تری جدائی میں مرنے والے فنا کے تیروں سے بے خطر ہیں
اجل کی ہم نے ہنسی اڑائی اسے بھی مارا تھکا تھکا کر

ہنسی بھی کچھ کچھ نکل رہی تھی مجھے بھی محشر میں تاکتی ہے
کہیں شفاعت نہ لے گئی ہو مری کتابِ عمل اٹھا کر

اڑا کے لائی ہے اے صبا تو جو بوئے زلفِ معنبریں کو
ہمیں سے اچھی نہیں یہ باتیں خدا کی رہ میں بھی کچھ دیا کر

یہ پردہ داری تو پردہ در ہے مگر شفاعت کا آسرا ہے

دبک کے محشر میں بیٹھ جاتا ہوں دامنِ تر میں منہ چھپا کر

شہید عشقِ نبی ہوں میری لحد پہ شمعِ قمر جلے گی

اُٹھا کے لائیں گے خود فرشتے چراغِ خورشید سے جلا کر

جسے محبت کا درد کہتے ہیں مایۂ زندگی ہے مجھ کو

یہ درد وہ ہے کہ میں نے رکھا ہے دل میں اس کو چھپا چھپا کر

خیالِ راہِ عدم سے اقبال تیرے در پر ہوا ہے حاضر

بغل میں زادِ عمل نہیں ہے صلہ مری نعت کا عطا کر

ترجمہ از ڈائک

دل شمع صفت عشق سے ہو نور سراپا

اور فکر یہ روشن ہو کہ آئینہ ہو گویا

نیکی ہو ہر اک فعل میں نیّت کی ہویدا

ہر حال میں ہو خالق ہستی پہ بھروسا

ایسی کوئی نعمت تہِ افلاک نہیں ہے

یہ بات جو حاصل ہو تو کچھ باک نہیں ہے

(سنہ ۱۹۰۴ء)

غزل

عاشق دیدار محشر کا تمنائی ہوا
وہ سمجھتے ہیں کہ جرمِ ناشکیبائی ہوا

غیر سے غافل ہوا میں اے نمودِ حسنِ یار
عرصۂ محشر میں پیدا کنجِ تنہائی ہوا

میری بینائی ہی شاید مانعِ دیدار تھی
بند جب آنکھیں ہوئیں تیرا تماشائی ہوا

ہائے میری بدنصیبی وائے ناکامی مری
پاؤں جب ٹوٹے تو شوقِ دشت پیمائی ہوا

میں تو اُس عاشق کے ذوقِ جستجو پر مر مٹا ، ما عرفنا کہہ کے جو تیرا تمنائی ہوا

تجھ میں کیا اے عشق وہ انداز معشوقانہ تھا ، حسن خود لولاک کہہ کر تیرا شیدائی ہوا

دیکھ ناداں امتیازِ شمع و پروانہ نہ کر ، حُسن بن کر عشق اپنا آپ سودائی ہوا

اب مری شہرت کی سوجھی ہے انہیں دیکھے کوئی
پس کے میں جب دم غبارِ کوئے رسوائی ہوا

غزل

محبت کو دولت بڑی جانتے ہیں ، اسے مایۂ زندگی جانتے ہیں

نرالے ہیں انداز دنیا سے اپنے ، کہ تقلید کو خودکشی جانتے ہیں

کوئی قید سمجھے مگر ہم تو اے دل ، محبت کو آزادگی جانتے ہیں

حسینوں میں ہیں کچھ وہی ہوش والے ، کہ جو حُسن کو عارضی جانتے ہیں

جو ہے گلشن طور اے دل تجھے ہم ، اُسی باغ کی اک کلی جانتے ہیں

غزل

چاہیں اگر تو اپنا کرشمہ دکھائیں ہم
بن کر خیالِ غیر ترے دل میں آئیں ہم

اچھی کہی شکایت جور و جفا کی بھی
اتنی سی بات کے لیئے محشر میں جائیں ہم

اے صدمۂ فراق نہ کر ہم سے چھیڑ چھاڑ
تو کس کا ناز ہے کہ تجھے بھی اُٹھائیں ہم

پوچھیں گے آج سرمۂ دنبالہ دار سے
کس طرح سے کسی کی نظر میں سمائیں ہم

ہر چیز منع تو ہے ہمیں اے طبیبِ عشق
لیکن بڑھے جو ضعف تو غش بھی نہ کھائیں ہم

قطعہ

یہ اشعار علامہ مرحوم نے نازلی بیگم صاحبہ جنجیرہ کے البم میں بیگم صاحبہ کی درخواست پر تحریر فرمائے تھے۔ علامہ کے جو خطوط عطیہ بیگم کے نام شائع ہوئے ہیں ان میں یہ اشعار علامہ کے قلم سے لکھے ہوئے موجود ہیں۔

اے کہ تیرے آستانے پر جبیں گستر قمر
اور فیضِ آستاں بوسی سے گل بر سر قمر

روشنی لے کر تری موجِ غبارِ راہ سے
دیتا ہے لیلائے شب کو نور کی چادر قمر

کاروانِ قوم کو ہے تجھ سے زینت اس طرح
جس طرح گمردوں پہ صدرِ محفلِ اختر قمر

شمعِ بزمِ اہلِ ملت را چراغِ طور کن
یعنی ظلمت خانۂ ما را سراپا نور کن

(۹ر جون ۱۹۰۸ء - لندن)

غزل

یہ غزل علامہ مرحوم نے کیمبرج سے لکھ کر عطیہ بیگم صاحبہ کو لندن میں بھیجی تھی اور بیگم صاحبہ نے جو مجموعہ علامہ رح کے خطوط کا شائع کیا ہے اُس میں یہ غزل ہے۔

اے گل ز خار آرزو آزاد چوں رسیدۂ — تو ہم ز خاکِ ایں چمن مانندِ ما دمیدۂ
اے شبنم از فضائے گل آخر ستم چہ دیدۂ — دامن ز سبزہ چیدۂ تا بہ فلک رسیدۂ
با من بگو کہ مثلِ گل ہمراہِ شاخ بستہ باش — مانندِ موج بو مرا آوارہ آفریدۂ
از لوحِ خویش باز پرس قصۂ جرم ہائے ما — آخر جوابِ نا سزا از لبِ ما شنیدۂ
ہنگامۂ دیر یک طرف، شورشِ کعبہ یک طرف — از آفرینشِ جہاں در دو سرے خریدۂ
ہستیم ما گدائے تو یا تو گدائے ما ستی — بہر نیاز سجدۂ در پسِ ما دویدۂ
افتی اگر بدست ما، حلقہ بگرد تو کشیم — ہنگامہ گرم کردۂ خود ز میاں رمیدۂ
اقبال غربتِ تو ام نشتر بہ دل ہمی زند — تو در ہجوم عالمے یک آشنا نہ دیدۂ

غزل

ہے کلیجا فگار ہونے کو
دامنِ لالہ زار ہونے کو

عشق وہ چیز ہے کہ جس میں قدر
چاہیئے بے قرار ہونے کو

جستجوئے قفس ہے میرے لیئے
خوب سمجھے شکار ہونے کو

پیس ڈالا ہے آسماں نے مجھے
کس کی رہ کا غبار ہونے کو

کیا ادا تھی وہ جاں نثار ہی ہیں
تھے وہ مجھ پر نثار ہونے کو

زخم اور سوزنِ رفو توبہ
کھل گیا بستہ کار ہونے کو

وعدہ کرتے ہوئے نہ رُک جاؤ
ہے مجھے اعتبار ہونے کو

اُس نے پوچھا کہ کون چھپتا ہے
ہم چھپے آشکار ہونے کو

ہم نے اقبال عشق بازی کی
پی یہ مے ہوشیار ہونے کو

حیدر آباد دکن

طلوعِ سحر

ہو رہی ہے زیرِ دامانِ افق سے آشکار
صبح یعنی دخترِ دوشیزۂ لیل و نہار

پا چکا فرصت درودِ فصلِ انجم سے سپہر
کشتِ خاور میں ہوا ہے آفتاب آئینہ کار

آسماں نے آمدِ خورشید کی پا کر خبر
محملِ پروازِ شب باندھا سرِ دوشِ غبار

شعلۂ خورشید گویا حاصل اس کھیتی کا ہے
بوئے تھے دہقانِ گردوں نے جو تاروں کے شرار

ہے رواں نجمِ سحر، جیسے عبادت خانے سے
سب سے پیچھے جائے کوئی عابدِ شب زندہ دار

کیا سماں ہے جس طرح آہستہ آہستہ کوئی
کھینچتا ہو میان کی ظلمت سے تیغِ آبدار

مطلعِ خورشید میں مضمر ہے یوں مضمون صبح
جیسے خلوت گاہِ مینا میں شرابِ خوشگوار

ہے تہِ دامانِ بادِ اختلاط انگیزِ صبح
شورشِ ناقوس آوازِ اذاں سے ہمکنار

جاگے کوئل کی اذاں سے طائرانِ نغمہ سنج — ہے ترنم ریز قانونِ سحر کا تار تار

گرچہ قدرت نے مجھے افسردہ دل پیدا کیا — آنکھ وہ بخشی کہ ہے نظارہ آشامِ بہار

کھینچ کر سوئے گلستاں لے گیا ذوقِ نظر — عاشقِ فطرت کو ہے صحنِ گلستاں کوئے یار

گل نے بلبل سے کہا اے ہمصفیر آیا ترا — کہتی تھی بلبل کہ اے مقصودِ چشمِ انتظار

اتنے دن غائب رہا تو گلشنِ پنجاب سے — کر لیا تھا کیا کسی صیاد نے تجھ کو شکار

کس سے کہتے راز اپنا لالہ ہائے شعلہ پوش — کس پہ کرتے دردِ دل اپنا عنادل آشکار

پوچھتی تھی روز مجھ سے نرگسِ شبنم فریب — ہو گیا غائب کہاں اپنے چمن کا رازدار

پھول فرقت میں تری سوزن بہ پیراہن رہے — دیدۂ قمری میں تھا صحنِ گلستاں خارزار

غنچۂ نوخیز کو یہ کہہ کے بہلاتی تھی میں — ہے یہیں پوشیدہ وہ وارفتۂ فصلِ بہار

کچھ تو کہہ ہم سے بھی اس وارفتگی کا ماجرا — لے گیا تجھ کو کہاں تیرا دلِ بے اختیار

کس تجلی گاہ نے کھینچا ترا دامانِ دل

تیری مشتِ خاک نے کس دیس میں پایا قرار

کیا کہوں اس بوستانِ غیرتِ فردوس کی ۔ جس کے پھولوں میں ہوائے ہم نوا میرا گذار
جس کے ذرے مہرِ عالمتاب کو سامانِ نور ۔ جس کی طور افروزیوں پر دیدۂ موسیٰ نثار
خطۂ جنت، فضا جس کی ہے دامنگیرِ دل ۔ عظمتِ دیرینۂ ہندوستاں کی یادگار
جس نے اسمِ اعظمِ محبوب کی تاثیر سے ۔ وسعتِ عالم میں پایا صورتِ گردوں وقار

نور کے ذروں سے قدرت نے بنائی یہ زمیں
آئینہ ٹپکے دکن کی خاک اگر پائے فشار

آستانے پر وزارت کے ہوا میرا گذر ۔ بڑھ گیا جس سے مرا ملکِ سخن میں اعتبار
اس قدر حق نے بنایا اس کو عالی مرتبت ۔ آسماں اس آستانے کی ہے اک موجِ غبار
کی وزیرِ شاہ نے وہ عزت افزائی مری ۔ چرخ کے انجم مری رفعت پہ ہوتے تھے نثار
مسند آرائے وزارت راجۂ کیواں حشم ۔ روشن اس کی رائے روشن سے نگاہِ روزگار
اس کی تقریروں سے رنگیں گلستانِ شاعری ۔ اس کی تحریروں پہ نظمِ مملکت کا انحصار
لیلیٰ معنی کا محمل اس کی نثرِ دلپذیر ۔ نظم اُس کی شاہدِ رازِ ازل کی پردہ دار

اس کے فیضِ پا کی منت خواہ کانِ لعل خیز
بحرِ گوہر آفریں دستِ کرم سے شرمسار

سلسلہ اس کی مروت یونہی لا انتہا
جس طرح ساحل سے عاری بحرِ ناپیدا کنار

دل ربا اس کا تکلم، خلق اس کا عطرِ گل
غنچۂ گل کے لیے موجِ نفس بادِ بہار

ہو خطا کاری کا ڈر ایسے مدبر کو کہاں
جس کی ہر تدبیر کی تقدیر ہو آئینہ دار

ہے یہاں شانِ امارت پردہ دارِ شانِ فقر
خرقۂ درویشی کا ہے زیرِ قبائے زرنگار

خاکساری جوہرِ آئینۂ عظمت بنی
دستِ وقفِ کارفرمائی و دل مصروفِ یار

نقش وہ اُس کی عنایت نے مرے دل پر کیا
محو کر سکتا نہیں جس کو مرورِ روزگار

شکر یہ احساں کا اے اقبال لازم تھا مجھے
مدح پیرائی امیروں کی نہیں میرا شعار

مکافاتِ عمل

یہ اشعار منشی سراج الدین صاحب کی بیاض سے لیئے گئے ہیں جو انہوں نے کسی رسالے یا علامہ مرحوم کے کسی خط سے نقل کیئے تھے۔

ہر عمل کے لیے ہے ردِ عمل
دہر میں عیش کا جواب ہے نیش

شیر سے آسمان لیتا ہے
انتقام غزال و اشتر و میش

سرگذشتِ جہاں کا سرِّ خفی
کہہ گیا ہے کوئی نکو اندیش

شمع پروانہ را بسوخت ولے
زود بریاں شود بروغنِ خویش

قطعہ

اقبالؒ نے اپنی نظم "شمع اور شاعر" انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسہ میں پڑھنے سے قبل مندرجہ ذیل قطعہ پڑھا تھا۔ چونکہ نظم طویل تھی اس لیے علامہ مرحوم نے اسکو دو نشستوں میں سنایا تھا۔ ایک نشست کی صدارت فقیر افتخار الدین صاحب نے فرمائی تھی اور دوسری نشست کی صدارت مرزا سلطان احمد صاحب نے اسی مناسبت سے قطعہ میں سلطان اور فقیر کی طرف اشارہ ہے۔

ہم نشینِ بے ریائم از رہِ اخلاص گفت　　　　اے کلامِ تو فروغِ دیدۂ برنا و پیر

درمیانِ انجمن معشوقِ ہرجائی مباش　　　　گاہ با سلطان باشی گاہ باشی با فقیر

گفتمش اے ہمنشیں معذور می دارم ترا　　　　در طلسمِ امتیازِ ظاہری ہستی اسیر

من کہ شمعِ عشق را در بزم افروختم

سوختم خود را و سامانِ دوئی ہم سوختم

پیش کش

(بحضور سر سید علی امام مرحوم)

مرقومہ ذیل اشعار مثنوی اسرارِ خودی کے پہلے ایڈیشن میں بطریق انتساب درج تھے دوسرے ایڈیشن میں انتساب کو حذف کر دیا مگر بعض اشعار کو تمہید میں جگہ دیدی۔ یہاں کل اشعار یک جا پیش کیے جاتے ہیں۔

اے امام اے سیدِ والا نسب ۔۔۔ دودمانت فخرِ اشرافِ عَرب
سلطنت را دیدہ افروز آمدی ۔۔۔ عقلِ کل را حکمت آموز آمدی

آشنائے معنیٔ بیگانۂ — جلوۂ شمع مرا پروانۂ

مُرغِ فکرم گلستانہا دیدہ است — از ریاضِ زندگی گل چیدہ است

این گل از تارِ رگِ جاں بستہ ام — تازہ تر در دستِ تو گلدستہ ام

بود نقشِ ہستیم انگارۂ — ناقبولے۔ ناکسے۔ ناکارۂ

عشق سوہاں زد مرا آدم شدم — عالمِ کیف و کمِ عالم شدم

حرکتِ اعصابِ گردوں دیدہ ام — در رگِ مہ دورۂ خوں دیدہ ام

بہرِ انساں چشمِ من شبہا گریست — تا دریدم پردۂ اسرارِ زیست

از درونِ کارگاہِ ممکنات — برکشیدم سرِّ تقویمِ حیات

من کہ ایں شب را چو مہ آراستم — گردِ پائے ملّتِ بیضاستم

ملتے در باغ و راغ آوازہ اش — آتشِ دلہا سرودِ تازہ اش

ذرہ کِشت و آفتاب انبار کرد — خرمن از صد رومی و عطار کرد

آہِ گرمم رخت بر گردوں کشم — گرچہ دُودم از تبارِ آتشم

خامہ ام از ہمتِ فکرِ بلند ۔ راز ایں نہ پردہ در صحرا فگند

قطرہ تا ہم پایہ دریا شود ذرہ از بالیدگی صحرا شود

ملت از جسم ست شاعر چشم اوست جسم را از چشم بینا آبروست

چشم از نورِ محبت روشنم اشکبار از دردِ اعضائے تنم

نذرِ اشکِ بے قرار از من پذیر

گریۂ بے اختیار از من پذیر

تاریخِ وفات شیخ عبدالحق

چوں مے جامِ شہادت شیخ عبدالحق چشید

باد بر خاکِ مزارش رحمتِ پروردگار

با عزیزاں داغِ فرقت داد در عینِ شباب

آستیں ہا از دُرِ اشکِ غمش سرمایہ دار

بندۂ حق بود ہم خدمت گذارِ قومِ خویش

سالِ تاریخِ وفاتِ او زعفراں آشکار

تاریخِ وفات میاں شاہدین ہمایوں

در گلستانِ دہر ہمایونِ نکتہ سنج
آمد مثالِ شبنم و چوں بوئے گل رمید

می جست عندلیبِ خوش آہنگ سالِ فوت
علامہ فصیح ز ہر جا یرسو شنید

تاریخِ فتح سمرنا

شاخِ ابراہیم رانم مصطفیٰ
مہدیِ آخر زماں ہم مصطفیٰ

گوش کن اے بے خبر تاریخِ فتح
گفت اقبال اسمِ اعظم مصطفیٰ

۱۳۴۱ھ

خلافت اور ترک و عرب

حضرت گرامی کی غزل بالا ہمارے پاس پوری نہیں بھیجی گئی ہے اس غزل میں ایک شعر تھا "فقر از ترکمانیٔ ہم ہست" جو حضرت اقبال کو بہت پسند آیا تھا اور اس پر تضمین کی تھی حضرت اقبال اپنے ایک گرامی نامہ میں ہمیں لکھتے ہیں "پیام مشرق" میں اس واسطے اس کو داخل نہ کیا کہ اس کے اشعار کی بندش کچھ بہت پسند نہ آئی۔ اگر آپ کو پسند ہو تو مجھے اشاعت میں کوئی عذر نہیں" یہ سچ ہے کہ پیام مشرق کے ساز میں یہ لحن شیرازی کچھ زیادہ سامعہ نواز نہ ہو تو بھی اس سے الگ اقبال کی صدا کا ہر حرف گوشوارۂ حقیقت ہے۔ (معارف جلد ۱۳ نمبر ۲ صفحہ ۱۴۴)

سخنے راندۂ کہ جز قرشی — بر سر مسند نبی نہ نشست

درس گیر از گرامی ہمہ درد — کہ برید از خود و باو پیوست

رمز ترک و خلافتِ عربی — گفت آں میگسار بزم الست

"ماہ را بر فلک دو نیم کنیم — فقر را ترکمانیٔ ہم ہست"

مرگِ قوم

یہ اشعار علامہ رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ سے لکھے ہوئے منشی سراج الدین صاحب کی بیاض میں چسپاں ہیں۔ شروع میں منشی سراج الدین صاحب کا یہ خیال تھا کہ یہ اشعار مثنوی اسرارِ خودی کے ہیں مگر جب مثنوی شائع ہوئی تو یہ خیال غلط ثابت ہوا۔

فرد برمی خیزد از مشتِ گِلے   قوم زائد از دلِ صاحب دلے

فرد بہرِ شصت و ہفتاد ست و بس   قوم را صد سال مثلِ یک نفس

زندہ فرد از ارتباطِ جان و تن   زندہ قوم از حفظِ ناموسِ کہن

مرگِ فرد از خشکیِ رودِ حیات   مرگ قوم از ترکِ مقصودِ حیات

یہ اشعار علامہ مرحوم نے جنگ عظیم ۱۴ء تا ۱۸ء کے دوران میں بعض احباب کی فرمائش پر لکھے تھے۔

ہیچ می دانی کہ صورت بندِ ہستی با فرانس   فکرِ رنگین و دلِ گرم و شرابِ ناب داد

روس را سرمایۂ جمعیت ملت ربود — قہر او کوہِ گراں را لرزۂ سیماب داد

ملک و تدبیر و تجارت را بہ انگلستاں سپرد — جرمنی را چشم حیران و دل بیتاب داد

تا برانگیزد نوائے حریت از سازِ دہر — صدر جمہوریۂ امریکہ را مضراب داد

ہر کسے در خورد فطرت از جناب او برد

بہر ما چیزے نہ بود و خویش را با ما سپرد

جلیانوالہ باغ امرتسر

ہر زائرِ چمن سے یہ کہتی ہے خاکِ باغ

غافل نہ رہ جہان میں گردوں کی چال سے

سینچا گیا ہے خونِ شہیداں سے اس کا تخم

تو آنسوؤں کا بخل نہ کر اِس نہال سے

مرثیۂ اکبر الٰہ آبادی

یہ مرثیہ پیام مشرق کے پہلے ایڈیشن میں شائع ہوا تھا۔ مگر بعد کے ایڈیشنوں سے علامہؒ نے حذف کر دیا۔ اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ پیام مشرق میں علامہؒ کے پیش نظر زیادہ تر وہ مسائل تھے جن کا تعلق اقوام اور ملل کی موت اور زندگی سے تھا اور مرثیہ کی نوعیت ایک دوست کا نوحہ ہونے کی حیثیت سے صرف شخصی اور ذاتی تھی۔

دریغا کہ رخت از جہاں بست اکبر　　حیاتش تجلی بود روشن دلیلے

سرِ ذروۂ طورِ معنی کلیمے　　بہ بت خانۂ دورِ حاضر خلیلے

نوائے سحرگاہِ او کارواں را　　اذانِ درائے پیامِ رحیلے

ز دلہا برافگندہ لات و عزیٰ　　بجانہا کشائندہ سلسبیلے

دماغش ادب خوردۂ عشق و مستی
دلش پرورش دادۂ جبرئیلے

حالی اور اقبال

علامہ مرحوم کی سب سے پہلی نظم جو انجمن حمایت اسلام کے پلیٹ فارم پر سنائی گئی وہ نالۂ یتیم تھی۔ جو ۱۸۹۹ء کے اجلاس میں پڑھی گئی تھی۔ یہ دل گداز اور زہرہ پاش نظم اس قدر مقبول ہوئی کہ انجمن کے جلسوں میں لوگ اقبال کی تلاش میں رہا کرتے تھے۔ علامہ بھی احباب کے اصرار و فرمائش کو رد نہ کر سکتے۔ اور جلسوں میں شرکت کر کے اپنی موثر نظموں سے سب کو رلاتے اور خود بھی قومی درد سے مجبور ہو کر روتے تھے۔ انجمن کے جلسوں کی مقبولیت اور اجتماعات کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے ——————————

کہ ایک اجلاس میں مولانا حالی۔ ڈاکٹر نذیر احمد۔ مرزا ارشد گورگانی۔ میاں سر محمد شفیع۔ سر عبدالقادر میاں سر فضل حسین۔ مولانا ابوالکلام آزاد۔ خواجہ حسن نظامی وغیرہ جیسے اکابر جمع تھے۔ رسم تھی کہ کسی کا کوئی شعر پسند کیا جاتا تو داد اس طرح دیتے کہ انجمن کو نقد عطیہ پیش کیا کرتے تھے۔

اقبال نے نظم پڑھی مولانا حالی مرحوم نے ایک شعر بہت پسند کیا اور انجمن کو دس روپیہ کا نوٹ

عطا فرمایا۔ سارا میدان نعرہ ہائے تحسین سے گونج اٹھا۔ شاعر کی اس سے زیادہ ہمت افزائی اور کیا ہو سکتی تھی کہ خدائے سخن حالی اس کے کلام کی داد دے۔ کچھ عرصہ بعد مولانا حالی کے پڑھنے کی باری آئی۔ یہ وہ وقت تھا کہ ان کی آواز سننی مشکل ہوتی تھی۔ چہ جائے کہ اس جلسہ میں جہاں لاتعداد انسانوں کا مجمع تھا۔ لوگ بے قرار تھے کہ خود اس مصلح اعظم کی زبان فیض ترجمان سے اس کا پیغام سنیں۔ اس لیے عجب افراتفری سی پیدا ہو چلی۔ آخر شیخ عبدالقادر صاحب نے کھڑے ہو کر مجمع کو خاموش کیا۔ اور فرمایا کہ آپ مولانا حالی کی زبان سے تبرکاً جو کچھ بھی سنا جائے سُن لیجیے بعد کو یہی نظم اقبال پڑھ کر سنائیں گے۔

جب اقبال مولانا حالی کی نظم سنانے کھڑے ہوئے تو اول ایک رباعی فی البدیہہ کہہ کر پڑھی جو اس موقعہ کے لحاظ سے بھی نیز اپنی بلاغت کے اعتبار سے بھی بہت خوب ہے۔ کہا تھا۔

مشہور زمانے میں ہے نامِ حالی　　　معمورِ مئے حق سے ہے جامِ حالی
میں کشورِ شعر کا نبی ہوں گویا　　　نازل ہے مرے لب پہ کلامِ حالی

مندرجہ ذیل اشعار جو حالی کی صد سالہ برسی پر نواب صاحب بھوپال کی موجودگی میں پڑھے گئے اور یہ اب تک اقبال کی کسی کتاب میں درج نہیں ہوئے ہیں۔

مزاجِ ناقہ را مانندِ عرفی نیک می بینم　　چو محمل را گراں بینم حدی را تیز تر خوانم

حمید اللہ خاں اے ملک و ملت را فروغ از تو　　ز الطاف تو موجِ لالہ خیزد از خیابانم

طواف مرقد حالی سزد ارباب معنی را　　نوائے او بجانہا افگند شورے کہ می دانم

بیا تا فقر و شاہی در حضورِ او بہم سازیم
تو بر خاکش گہر افشان و من برگِ گل افشانم

ایک دوسرے موقعہ پر حالی سے متعلق مندرجہ ذیل قطعہ کہا تھا۔

آں لالۂ صحرا کہ خزاں دید و بیفسرد　　سید دگر اورا نمے از اشک سحر داد

حالی ز نواہائے جگر سوز نیاسود　　تا لالۂ شبنم زدہ را داغ جگر داد

عرشی، اقبال اور ظفر علیخان

خمخانۂ اقبالؒ کے مستوں کو شاید مئے ناب میں حضرت عرشی اور مولانا ظفر علیخاں کے اشعار کی آمیزش خوشگوار نہ معلوم ہو مگر ان دونوں نظموں سے علامہ کے اشعار کی وضاحت ہوتی ہے لہذا ان کو یہاں یک جا جمع کر دیا گیا ہے۔

پیام عرشی امرتسری بنام اقبالؒ

اے ترنم ہائے رنگینت گلستان سخن — معنی علیسٰی دمت بخشندۂ جانِ سخن

اے حیاتِ تازہ دادی نغمہ را از نطقِ خویش — گشتۂ شور افگن ارض و سما از نطقِ خویش

از عروسِ طبع بر ما جلوہ ہا پاشیدۂ — وز چمن زارِ تکلم تازہ گلہا چیدۂ

شعلہ سوز اندوز از آتش نوائی ہائے تو — بادہ کیف آموز از تخییلِ ذوق افزائے تو

بر فرازِ طارمِ اعلیٰ لوا افراختی — نرد خود را در قمارِ جمیعِ ما در باختی

یافت از تو مرکزے ہنگامۂ بیتابِ ما — ریختی تخم سکوں در مزرعۂ سیماب ما

لیکن اے اقبال ایں رنگیں نوائی تابکے — از نفس گرمی و از دل شعلہ زائی تابکے

اے تو قی در آشیان و گلشنت برباد رفت — نغمہ ماندی و پروازِ تو با صیاد رفت

خیز و گلبانگِ دہل در گنبدِ خضرا فگن — از قبور آیند خلقے شور صور آسا فگن

خیز و صوتِ خود بہ آہنگِ رجز تبدیل کن — قطرہ داری بیاور در شرر تحلیل کن

خیز زیں کنجِ متانت جلوہ برما فگن — ہاں بیا ہمچوں تمنا گوئے در میداں فگن

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کا جواب

دانی کہ چیست شیوۂ مستانِ پختہ کار — عرشی گماں مدار کہ پیمانہ ام شکست

دارم ہنوز از کرمِ ساقیِ حجاز — آہے درونہ تاب کہ خیزد ز سینہ مست

از تا خمارِ فطرتِ من می دمد ہنوز — آں لالہ کہ موجِ نسیمے دلش نہ خست

لیکن شنیدہ کہ دمِ گردشِ شراب — پیرِ عجم چہ گفت برندانِ مے پرست

دانا کہ دید شعبدۂ چرخِ حقہ باز — ہنگامہ باز چید و درِ گفتگو بہ بست

۲۲ مئی سنہ ۱۹۲۰ء (زوالِ آلِ عثمان)

عرشی اور اقبال کی قیل و قال پر ظفر علیخاں کا محاکمہ

بندہ نواز ہم سے نہیں کچھ چھپی ہوئی ۔۔۔ پیرِ فلک کی شعبدہ بازی کی بود و ہست
مانا کہ آسمان سے شمس و قمر کی فوج ۔۔۔ پیہم اُتر رہی ہے کہ ظلمت کو دے شکست
لیکن نہ قولِ سعدیِ شیراز بھولیے ۔۔۔ چھوٹا نہیں جو ہاتھ سے سر رشتۂ الست

"رفتن بپائے مردیِ ہمسایہ در بہشت
حقا کہ با عقوبتِ دوزخ برابر است"

غزل

بلاکشانِ محبت کی یادگار ہوں میں ۔۔۔ مٹا ہوا خطِ لوحِ سرِ مزار ہوں میں
فنا ہوئے پہ بھی گویا وفا شعار ہوں میں ۔۔۔ جو مٹ گیا تو حسینوں کا اعتبار ہوں میں

نشہ میں مست سمجھتا ہے مجھ کو کیوں واعظ
وہ اپنا وعظ کہے جائے ہوشیار ہوں میں

تڑپ کے شان کریمی نے لے لیا بوسہ
کہا جو سر کو جھکا کر گنہگار ہوں میں

رہی نہ زہر میں اقبال وہ پرانی بات
کسی کے ہجر میں جینے سے شرمسار ہوں میں

غزل

کیا تھا گردشِ ایام نے مجھے محزوں
بدن میں جان تھی جیسے قفس میں صید زبوں

جو سامنے تھی مرے قوم کی بری حالت
اُمڈ گیا مری آنکھوں سے خون کا سیحوں

ہزار شکر کہ اک انجمن ہوئی قائم
یقیں ہے راہ پہ آئے گا طالع واژوں

ہلال وار اگر منہ میں دو زبانیں ہوں
ادا نہ پھر بھی ہو شکر خدائے کن فیکوں

کرم سے اس کے وہ صورت فلاح کی نکلی
کہ حصن قوم ہر اک شر سے ہو گیا مصئوں

چراغ عقل کو روشن کیا ہے ظلمت میں ہمارے ہاتھ میں آجائے گا در مکنوں
بڑھے یہ بزم ترقی کی دوڑ میں یارب کبھی نہ ہو قدمِ تیز آشنائے سکوں
اسی سے ساری امیدیں بندھی ہیں اپنی کہ ہے وجود اس کا پئے قصرِ قوم مثلِ ستوں
کچھ ان میں شوق ترقی کا حد سے بڑھ جائے ہماری قوم پہ یارب وہ پھونک دے افسوں
دکھائیں فہم و ذکاوہنر یہ اوروں کو زمانے بھر کے یہ حاصل کریں علوم و فنوں

جو تیری قوم کا دشمن ہو اس زمانے میں
اُسے بھی باندھ لے اقبال صورتِ مضموں

شیخ عطاءاللہ صاحب ایم۔ اے مرتب "اقبال نامہ" راقم کو اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں "کوشش تو کر رہا ہوں کہ اقبال کے ہاتھ کی ہر نوعیت کی تحریریں دستبرد زمانہ سے محفوظ ہو جائیں۔ تین شعر (غیر مطبوعہ) انتخابات کے ایک پوسٹر سے لاہور سے ملے ہیں۔ امید کہ ان کے مطالعہ سے آپ کو مسرت حاصل ہوگی۔ خیال ہے کہ اقبال نامہ کے

صفحۂ اول پر انہیں درج کراؤں"۔ جس پوسٹر میں یہ اشعار تھے وہ شیخ صاحب کے پاس موجود ہے۔ مگر اس کے علاوہ کوئی شہادت ایسی نہیں ہے جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ یہ اشعار علامہ مرحوم کے ہی ہیں۔ اگر ناظرین کرام میں سے کسی کو اس کا علم ہو تو براہ کرم راقم الحروف کو مطلع فرمائیں۔

احتساب خویش کن از خود مرو　　　یک دو دم از غیر خود بیگانہ شو

تا کجا این خوف و وسواس و ہراس　　　اندرین کشور مقام خود شناس

این چمن دارد بسے شاخ بلند

بر نگوں شاخ آشیان خود مبند

قطعہ

حکیم عبدالوہاب صاحب انصاری عرف حکیم نابینا جو شروع میں حیدر آباد دکن میں سکونت پذیر تھے مگر بعد میں دہلی میں مطب فرمانے لگے تھے اپنے فن میں یکتائے روزگار

تھے۔ علامہ مرحوم نے آخری زمانۂ علالت میں حکیم صاحب قبلہ کی طرف رجوع کیا تھا۔ حکیم صاحب نے علامہؒ کے لیے اپنی شہرۂ آفاق دوا روح الذہب تجویز فرمائی تھی اس دوا سے علامہؒ کو بہت فائدہ ہوا تھا۔ اس افاقہ کے تاثرات علامہ نے اس قطعہ میں قلمبند فرمائے ہیں۔ یہ قطعہ علامہ مرحوم نے جناب نذیر نیازی کو ایک خط میں لکھ کر بھیجا تھا تاکہ حکیم صاحب قبلہ کے گوش گذار کر دیں۔ جناب نذیر نیازی نے اس واقعہ کا ذکر اپنے مضمون "اقبال کی آخری علالت" میں کیا ہے۔

ہے دو روحوں کا نشیمن پیکرِ خاکی مرا
رکھتا ہے بیتاب دونوں کو مرا ذوقِ طلب
ایک جو اللہ نے بخشی مجھے صبحِ ازل
دوسری ہے آپ کی بخشی ہوئی روح الذہب

مولانا محمد علی مرحوم کی وفات پر

یہ اشعار علامہ مرحوم نے مولانا محمد علی مرحوم کی انگلستان میں وفات پر لکھے تھے۔ اور جراید ول میں شائع ہو چکے ہیں۔ راقم الحروف نے یہ اشعار سر عبدالقادر کی زبانی سنے تھے۔ عبدالقادر صاحب کو یہ مصرع بے حد پسند تھا ع سوئے گردوں رفت زاں راہے کہ پیغمبر گذشت۔

یک نفس جانِ نزارِ او تپید اندر فرنگ
تا مژہ برہم زنیم از ماہ و پرویں در گذشت

اے خوشا مشتِ غبار او کہ در جذبِ حرم
از کنارِ اندلس از ساحلِ بربر گذشت

خاکِ قدس اُو را بآغوشِ تمنا در گرفت
سوئے گردوں رفت زاں راہے کہ پیغمبر گذشت

می نہ گنجد جز باں خاکے کہ پاک از رنگ و بوست
بندۂ کو از تمیزِ اسود و احمر گذشت

جلوۂ او تا ابد باقی بچشمِ آسیاست
گرچہ آں نورِ نگاہ خاور از خاور گذشت

(منقول از بیاض منشی سراج الدین صاحب)

دُعا

مولانا عبدالمجید صاحب سالک بی۔ اے مدیر انقلاب نے "اقبال اور اس کا پیغام" (جو ڈاکٹر تصدق حسین صاحب خالد اور میاں محمد رفیق صاحب خاور کی کوششوں کا نتیجہ ہے) کے دیباچہ میں علامہ مرحوم کے یہ اشعار نقل کیے ہیں مولانا کی تمہید کے ساتھ یہاں نقل کیے جاتے ہیں

"آج سے چند سال پیشتر جب علامہ اقبال درد گردہ میں مبتلا ہوئے تو اس ظالم مرض کی صعوبت سے بے قرار ہو کر آپ نے خُدا کو مخاطب کیا کہ ۔۔۔۔

دہ مرا فرصت ہُو حق دو سہ روزے دگرے　　　که دریں دیرِ کہن بندۂ بیدار کجاست

میر و مرزا بسیاست دل و دیں باختہ اند　　　جز برہمن پسرے محرم اسرار کجاست

حرفِ ناگفتہ مجالِ نفسے می خواہد

ورنہ ما را بہ جہانِ نو سر و کار کجاست

متفرقات

یہ باب ان اشعار پر مشتمل ہے جو اصل نظموں سے حذف کر دیے گئے تھے۔
اصل نظمیں مختلف مجموعوں میں شائع ہو چکی ہیں۔ چونکہ ہمارے لیے یہ متروکہ اشعار
بھی ایک گراں بہا سرمایہ ہیں اس لیئے ان کو یک جا کر کے زیور طباعت سے آراستہ کرنا
ضروری سمجھا گیا۔

غزل

مرقومہ ذیل دو شعر اُس غزل کے ہیں جو علامہ مرحوم نے طالب علمی کے زمانہ میں حکیم امین الدین صاحب مرحوم کے مکان واقعہ اندرون بھاٹی دروازہ میں ایک مشاعرہ میں پڑھے تھے۔ اس مشاعرہ میں جناب ارشد گورگانی بھی موجود تھے اور انھوں نے پہلے شعر پر بے حد داد دی تھی۔ پوری غزل کے حاصل کرنے کی بے حد کوشش کی گئی، مگر کامیابی نہیں ہوئی یہ دو شعر یہاں اِس لیے درج کیے جاتے ہیں کہ جن صاحب کے پاس باقی اشعار ہوں وہ براہ کرم ارسال فرمادیں:۔

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چُن لیے قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

اقبال لکھنؤ سے نہ دِلّی سے ہے غرض
ہم تو اسیر ہیں خمِ زلفِ کمال کے

غزل

(پوری غزل کے بارہ شعر ہیں)

ہمصفیرو تم مری عالی نگاہی دیکھنا
شاخِ نخلِ طور تاڑی آشیانے کے لیے

قصہ خواں نے کیوں سنا دی داستاں مجھ کو مری
رہ گیا تھا میں ہی کیا اپنے فسانے کے لیے

عشق نے مٹی کو مسجودِ ملائک کر دیا
ورنہ انساں اور فرشتے سر جھکانے کے لیے

صبحِ پیدائش یہ کہتا تھا کسی سے دردِ عشق
آنکھ رونے کے لیے دل ٹوٹ جانے کے لیے

ترک کر دی تھی غزل خوانی مگر اقبالؔ نے
یہ غزل لکھی ہمایوںؔ کو سنانے کے لیے

(سنہ ۱۹۰۱ عیسوی)

* میاں محمد شاہدین ہمایوں بیرسٹر ایٹ لا۔

غزل

(سنہ ۱۹۰۳ عیسوی)

(پوری غزل کے انیس شعر ہیں۔ جو شعر بانگِ درا میں نہیں ہیں صرف ان کو درجِ ذیل کیا جاتا ہے)۔

نہ سیکھی تو نے مرغِ رنگِ گل سے رمزِ آزادی
یہ قیدِ بوستاں بلبل خیالِ آشیاں تک ہے

بنائیں چارہ گر نے دیدۂ حیراں کی زنجیریں
نظر آسا مری وحشت میں بے تابی یہاں تک ہے

ہیں خارِ خشک پہلو شعلۂ گلخن کے قابل ہوں
پڑے رہنا مرا گلشن میں رحمِ باغباں تک ہے

مثالِ عکس بے تارِ نفس ہے زندگی میری

تری آسیب کاری اے اجل اقلیمِ جاں تک ہے،

زباں تک عقدۂ تبخالہ بن کر رہ گیا مطلب

اثر مجھ دل جلے کی لبستہ کاری کا کہاں تک ہے

نہیں منت پذیرِ چشم رونا شمعِ سوزاں کا

سمجھ غافل گدازِ دل میں آزادی کہاں تک ہے،

بھلا اے گل کبھی اس رمز کو بھی تو نے سمجھا ہے

تری شبنم فریبی کیوں بہارِ بوستاں تک ہے،

یہ ہے اقبال فیض یادِ نامِ مرتضیٰ جس سے

نگاہِ فکر میں خلوت سرائے لامکاں تک ہے

صبح کا ستارہ

عارضی حُسن ہے دشمن ہے مرا نورِ سحر یہ ملا خسرو خاور کا پیامی بن کر

صبر کا خون نکل آیا ہو مل کر مجھ میں

ایک طوفاں ہو افکار کا مضمر مجھ میں

(۱۹۰۴ء)

صدائے درد

صدائے درد کے عنوان سے جو نظم بانگ درا میں ہے اس میں مرقومہ ذیل اشعار نہیں ہیں۔

پھر بلا لے مجھ کو اے صحرائے وسطِ ایشیا

آہ اس بستی میں اب میرا گذارا ہو چکا

پار لے چل مجھ کو پھر اے کشتیِ موجِ اٹک
اب نہیں بھاتی یہاں کے بوستانوں کی مہک
ہاں سلام اے مولد بوذاسف گوتم تجھے
اب فضا تیری نظر آتی ہے نامحرم مجھے
الوداع اے سیر گاہِ شیخ شیراز الوداع
اے دیار بالمیک نکتہ پرداز الوداع
الوداع اے مدفن ہجویری اعجاز دم
رخصت اے آرام گاہِ شنکرِ جادو رقم
الوداع اے سرزمین نانکِ شیریں بیاں
رخصت اے آرام گاہِ چشتیِ عیلے نشاں
رمز الفت سے مرے اہلِ وطن غافل ہوئے
کارزار عرصۂ ہستی کے ناقابل ہوئے

اپنی اصلیت سے ناواقف ہیں کیا انسان ہیں
غیر اپنوں کو سمجھتے ہیں عجب نادان ہیں
جس کا اک مدت سے دھڑکا تھا وہ دن آنے کو ہے
صفحۂ ہستی سے اپنا نام مٹ جانے کو ہے
دل حزیں ہے، جان رہن رنج بے اندازہ ہے
آہ اک دفتر ہے اپنا وہ بھی بے شیرازہ ہے
امتیاز قوم و ملت پر مٹے جاتے ہیں یہ
اور اس الجھی ہوئی گتھی کو سلجھاتے ہیں یہ
ہم نے یہ مانا کہ مذہب جان ہے انسان کی
کچھ اسی کے دم سے قائم شان ہے انسان کی
روح کا جوبن نکھرتا ہے اسی تدبیر سے
آدمی سونے کا بن جاتا ہے اس اکسیر سے

رنگ قومیت مگر اس سے بدل سکتا نہیں
خونِ آبائی رگِ تن سے نکل سکتا نہیں

اصل محبوبِ ازل کی ہیں یہ تدبیریں سبھی
اک بیاضِ نظمِ ہستی کی ہیں تصویریں سبھی

ایک ہی شے ہے اگر ہر چشمِ دل مخمور ہے
یہ عداوت کیوں ہماری بزم کا دستور ہے

عہدِ طفلی

یہ نظم بانگِ درا میں ہے مگر مرقومہ ذیل بند اس میں نہیں ہیں۔

ہاں اُٹھا اے ساحرِ ایام یہ جادو ذرا
ابلقِ گردوں نہ ہو محوِ رمِ آہو ذرا

ہائے پھر آجا کہیں سے عمرِ رفتہ تو ذرا
لا وہ نظارہ پے چشم تماشا جو ذرا

خون رُلواتے ہیں ایام جوانی کے مزے
لا کہیں سے پھر وہی ایام طفلی کے مزے

ہائے وہ عالم کہ عالمگیر تھی اپنی ادا
غیرتِ صد فصلِ گل تھی اپنے گلشن کی ہوا

مکتبِ طفلی میں غیر از درسِ آزادی نہ تھا
زنگِ افکارِ جہاں سے شیشۂ دل تھا صفا

مایہ دارِ صد مسرت اک تبسم تھا مرا
گوشِ دل لگ جائیں جس پر وہ تکلم تھا مرا

آہ اے دنیا نمک پاشِ خراشِ دل ہے تو
جس کے ہر دانے میں سو بجلی ہوں وہ حاصل ہے تو

جو مسافر سے پرے رہتی ہے وہ منزل ہے تو
جس کی لیلیٰ مایۂ وحشت ہو وہ محمل ہے تو

میرے ہاتوں کوئی جو پائے تو تسکیں نہ ہو
ایمن از مارِ زمینِ گلستاں گلچیں نہ ہو

التجائے مسافر

یہ نظم بانگِ درا میں موجود ہے ۔ محذوفہ اشعار کو یہاں درج کیا جاتا ہے ۔ نیز نظم کے شانِ نزول میں مولانا سید غلام بھیک نیرنگ کے رشحاتِ قلم بھی کچھ کم دلچسپ نہیں ہیں ۔ ہم اشعار کے ساتھ سید صاحب موصوف کی عبارت بھی نقل کیے دیتے ہیں ۔ کہ ناظرین کا لطف دوبالا ہو جائے ۔

" ۲ ستمبر ۱۹۰۵ء ہمارے خاص احباب کی تاریخ محبت میں ایک قابل یادگار دن ہے ۔ صبح کا سہانا سماں ہے ۔ بمبئی میل دہلی کے ریلوے اسٹیشن پر پہنچی ہے جو خواجہ سید حسن نظامی دہلوی اور منشی نذر محمد بی ۔ اے اسٹیشن پر استقبال کو آئے ہیں ۔ استقبال کس کا ہے ، جدید شاعری کی روح رواں اقبال یا اقبال اور اس کے ہمراہیوں کا ۔ وہ کیسے ؟ اقبال بغرض تعلیم علوم و فنون انگلستان کو روانہ ہوئے ہیں ۔ نیرنگ اور اکرام اپنے پیارے دوست کو رخصت کرنے کے لیے دہلی تک ساتھ گئے ہیں ۔ ریل

سے اتر کر اول منشی نذر محمد صاحب کے مکان پر تھوڑی دیر آرام کیا۔ بعد میں سب دوست مل کر حضرت محبوب الٰہی خواجہ نظام الدین اولیا قدس سرہٗ کی درگاہ آسمان پائیگاہ کی طرف روانہ ہوئے۔ راستہ میں شہنشاہ ہمایوں کے مقبرے کی زیارت اور سیر کی۔ درگاہ میں پہنچکر مزار مبارک پر حاضر ہوئے۔ اول اقبال نے عالم تنہائی میں مزار مبارک کے سرہانے بیٹھ کر ذیل کی نظم پڑھی اور ان کی درخواست پر سب احباب باہر صحن میں ٹھہرے رہے۔ بعد میں دوستوں کے اصرار پر اقبال نے اس نظم کو درگاہ کے صحن میں بیٹھ کر مزار مبارک کی طرف منہ کر کے دوبارہ ایک نہایت دردانگیز اور دل نشیں لہجہ میں پڑھا۔ سب احباب اور دیگر سامعین نہایت متاثر ہوئے۔ اور بے تحاشا زبان سے موقع بموقع کلماتِ تحسین و آفرین نکلتے تھے۔ ایک محویت کا عالم تھا کہ جس کی تصویر حاضرین کے تصور ہی کھینچ سکتے ہیں۔ درگاہ سے واپس ہو کر خواجہ حسن نظامی صاحب کے مکان پر قیام کیا۔ ولایت نامی ایک نوعمر قوال خواجہ صاحب کی خدمت میں حاضر تھا۔ نوتعلیم تھا مگر خوش گلو اور باطبیعت۔ وہ کچھ گاتا رہا اور وقت نہایت مزے

اور کیفیت سے گزرا۔ اس کے بعد شہر کو واپس ہوئے۔ واپسی کے وقت خاتم الشعراء مرزا اسداللہ خاں غالبؔ کی تربت پر حاضر ہوئے۔ عجیب کیفیت تھی۔ بندہ نیرنگ مرزا صاحب کی تربت کے سرہانے لوح تربت پر ہاتھ رکھے ہوئے بیٹھا تھا۔ میرے دائیں جانب اقبال عالم محویت میں بیٹھے تھے اور تربت کے گرداگرد تمام پارٹی حلقہ باندھے ہوئے تھی۔ دو بجے دن کا وقت اور دن بھی ستمبر کا، دھوپ تیز اور ہوا میں گھمس مگر اسی قبر کی زیارت کا اثر تھا کہ کسی کو گرمی کا خیال تک نہ تھا۔ قوال تادے کو عجیب وقت کی سوجھی۔ بولا حضور! مرزا غالب کی ایک غزل یاد آئی اگر اجازت ہو تو سناؤں۔ سرود مستاں یاد دہانیدن یہاں عذر کس کو تھا۔ چنانچہ اس نے یہ غزل گائی۔

دل سے تری نگاہ جگر تک اُتر گئی

دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی

ذیل کے دو شعروں پر عجیب کیفیت رہی۔

اُڑتی پھرے ہے خاک مری کوئے یار میں

بارے اب اے خدا ہوسِ بال و پر گئی

وہ بادہ شبانہ کی سرمستیاں کہاں

اُٹھیے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی

غزل کے ختم ہونے پر جب ایک دو منٹ میں ذرا ہوش بجا ہوئے تو سب چلنے کو اُٹھے۔ اقبال نے جوشِ محویت میں مرزا صاحب کے مزار کو بوسہ دیا اور سب شہر کو روانہ ہوئے۔

اچھا اقبال

بہ سفر رفتنت مبارک باد

بسلامت روی و باز آئی

زندہ رہیں گے تو تین سال بعد تیرے کلام کو تیری زبان سے پھر سنیں گے۔

ترے وجود سے روشن ہے راہِ منزلِ عشق — دیارِ عشق کا مصحف کلام ہے تیرا

خروشِ میکدۂ شوق ہے ترے دم سے — طلب ہو خضر کو جس کی وہ جام ہے تیرا

کرم کرم کہ غریب الدیار ہے اقبال — مرید پیر نجف ہے غلام ہے تیرا

کیا ہے تیرا مقدر نے مدح خواں مجھ کو
کہے ہزار مبارک مری زباں مجھ کو

چڑھا کے پھول مرے رنگ رفتہ کے سر قبر
اُڑائے پھرتی ہے حیرت کہاں کہاں مجھ کو

بیاں کروں تپشِ عشق کو تو آتشِ دل
شرارے دے پئے تمہید داستاں مجھ کو

میں تفتہ دل ہوں پرانا نیاز مند ترا
دکھایا آج خدا نے یہ آستاں مجھ کو

تلاش جھر میں شبنم صفت اُڑا کے چمن
ذرا سا دیتا ہے غنچہ کا آشیاں مجھ کو

گریز میرے دلِ دردمند کا ہے شعار
بہت ستاتا ہے اندیشۂ زیاں مجھ کو

بنایا تھا جسے چُن چُن کے خار و خس میں نے
چمن میں پھر نظر آئے وہ آشیاں مجھ کو

مرا وہ یار بھی معشوق بھی برادر بھی
کہ جس کے عشق سے جنت ہے یہ جہاں مجھ کو

یونہی بنی رہے محفل مرے احبا کی
ہرا بھرا نظر آئے یہ بوستاں مجھ کو

بھلا ہو دونوں جہاں میں حسن نظامی کا
ملا ہے جس کی بدولت یہ آستاں مجھ کو

قسم ہے اس کے دلِ دردمند کی آقا
تری ثنا کے لیے حق نے دی زباں مجھ کو

خفتگانِ خاک سے استفسار

(۱۹۰۳ سنہ عیسوی)

یہ نظم بھی علاوہ ذیل کے اشعار کے بانگِ درا میں موجود ہے۔

کام دھندا ہو چکا اب نیند ہے آرام ہے
ہائے وہ آغاز محنت جس کا یہ انجام ہے!

وہ ولایت بھی ہمارے دیس کی صورت ہے کیا
شب وہاں کی کیا ہے، صبح و شام کی رنگت ہے کیا

دل میں ہوتے ہیں اسی صورت سے پیدا ولولے
اس ولایت میں بھی کیا محبوب کہتے ہیں اسے

اِس جُدائی میں نہفتہ وصل کا ساماں ہے کیا
چشمِ بستہ سرمۂ گوہر پے انساں ہے کیا

غزل

مندرجہ ذیل اشعار کے علاوہ باقی اشعار بانگِ درا میں موجود ہیں ۔

کوئی یوں گیا ہے ادھر سے نکل کر قیامت تھی بجلی تھی رفتار کیا تھی

نہ چھوڑا کبھی بے وفائی نے تم کو مری طرح یہ بھی وفادار کیا تھی

ہزاروں کلیجے کو تھامے ہوئے ہیں الٰہی وہ چشمِ فسوں کار کیا تھی

لیا مغفرت نے تڑپ کر بغل میں
کرامت تھی شرمِ گنہگار کیا تھی

(محمد کرامت اللہ عثمانی منیجر مشہور آفسٹ لیتھو پریس کراچی نے طبع کیا)

ظریفانہ

یہ تمام قطعات مولوی عبدالرزاق صاحب نے کلیاتِ اقبال میں درج

کیے ہیں۔

(۱۰)

اخبار میں یہ لکھتا ہے لندن کا پادری
ہم کو نہیں ہے مذہب اسلام سے عناد
لیکن وہ ظلم ننگ ہے تہذیب کے لیے
کرتے ہیں ارمنوں پہ جو ترکانِ بد نہاد
مسلم بھی ہوں حمایتِ حق میں ہمارے ساتھ
مٹ جائے تا جہاں سے بنائے شر و فساد
سن کر یہ بات خوب کہا شہنواز نے
بلی چوہے کو دیتی ہے پیغامِ اتحاد

(۲)

بخت مسلم کی شب تار سے ڈرتی ہے سحر

تیرگی میں ہے یہ شب دیدۂ آہو کی طرح

ہے اندھیرے میں فقط مولوی صاحب کی نمود

بن کے شمس العلما چمکے ہیں جگنو کی طرح

(۳)

ہند کی کیا پوچھتے ہو اے حسینانِ فرنگ!

دل گراں، ہمت سبک، ووٹر فزوں، روزی تنگ،

بے ٹکٹ بے پاس بھارت کی سیاسی ریل میں

ہو گیا آخر میتا بھی مع اسباب مبک

"ٹک ووِن" کا حکم تھا اس بندۂ اللہ کو

اب یہ سنتے ہیں نکلنے کو ہے "مسلم آوٹ ٹک"

کیا عجب پہلے ہی لیڈر ہیں یہ کر دے آشکار

کس طرح آیا کو لے کر اُڑ گیا صاحب کا ٹُک

ختم تھا مرحوم اکبرؔ پر ہی یہ رنگ سخن

ہر سخنور کی یہاں طبعِ رواں جاتی ہے رُک

قافیہ اِک اَور بھی اچھا تھا لیکن کیا کریں

کر دیا متروک دلّی کے زباں دانوں نے ٹک

---

(۴)

عمل عاشقوں کے ہیں بے طور سارے ۔۔۔ نہیں اس کمیٹی کا کوئی اجنڈا

تمہیں ہند سرمایہ دار و مبارک ۔۔۔ سلامت رہے مجھ کو فیجی، یوگنڈا

میں ڈنڈے پہ فدا کہ تو انڈے پہ راضی

مرا پیر ڈنڈا، ترا پیر انڈا

(۵)

پٹی خوب جُمّن کے ہاتھوں نصیبن — گئی عرس میں اور شب بھر نہ آئی

نہیں بار صاحب کے ٹیبل پہ اس کو — پڑی روپ لبسکٹ کا دھارے خطائی

خُدا کی زمیں تھی مزارع نے جوتی

کمائی مگر چودھری جی نے کھائی

(۶)

جناب شیخ کو پلواؤ خاص لندن کی

عجیب نسخہ ہے یہ خود فراموشی کے لیے

ہمارے حق میں تو جینا بتر ہے مرنے سے
جو زندہ ہیں تو فقط آپ کی خوشی کے لیے

ہوا میں جینے سے بیزار جب تو فرمایا
کہاں سے لاؤ گے بندوق خودکشی کے لیے

---

(۷)

محنت و سرمایہ دنیا میں صف آرا ہو گئے
دیکھیے ہوتا ہے کس کس کی تمناؤں کا خون
حکمت و تدبیر سے یہ فتنۂ آشوب خیز
ٹل نہیں سکتا وَقَدْ كُنْتُمْ بِهٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ
کھل گئے یاجوج اور ماجوج کے لشکر تمام
چشم مسلم دیکھ لے تفسیر حرفِ یَنْسِلُوْنَ

(۸)

یہ قطعہ علامہ مرحوم نے عطیہ بیگم کو ایک خط میں لکھا تھا۔ چنانچہ عطیہ بیگم کے نام علامہؒ کے جو خطوط شائع ہوئے ہیں اس مجموعے میں یہ قطعہ موجود ہیں۔

مندمل زخمِ دلِ بنگال آخر ہو گیا
وہ جو تھی پہلے تمیز کافر و مومن، گئی
تاجِ شاہی یعنی کلکتے سے دہلی آ گیا
مل گئی بابو کو دھوتی اور پگڑی چھن گئی

یتیم کا خطاب ہلال عید سے

باوجود

بے حد کوشش کے اس نظم کے چند ہی
بند دستیاب ہو سکے تھے - ان کو باقیاتِ اقبال میں
شامل کر لیا گیا تھا - مگر کتابت کے دوران میں جناب عنایت اللہ
کاتبِ کتابِ ہذا کی عنایت سے پوری نظم مل گئی
لہٰذا اب بطور ضمیمہ کے قارئین کرام کی خدمت میں
پیش کی جاتی ہے -

بندہ

واحد

بند اوّل

اے مہِ عید بے حجاب ہے تو
حسنِ خورشید کا جواب ہے تو

اے گریبانِ جامۂ شبِ عید
شاہدِ عیش کا شباب ہے تو

اے نشانِ رکوعِ سورۂ نور
نقشۂ کلکِ انتخاب ہے تو

اے جوابِ خطِ جبینِ نیاز
طاعتِ صوم کا ثواب ہے تو

ہائے اے حلقۂ پرِ طاؤس
قابلِ ذالکَ الکتاب ہے تو

فوجِ اسلام کا نشاں تو ہے
چشمِ نصرت کا انتخاب ہے تو

چشمِ طفلی نے جب تجھے دیکھا
کہہ دیا خواب کو کہ خواب ہے تو

طوقِ منزلگہِ زمیں کے لئے
ہمہ تن پائے در رکاب ہے تو

یہ اُبھرتے ہی آنکھ سے چھپنا
روشنی کا مگر حباب ہے تو

تو کمندِ غزالِ شادی ہے
لذت افزائے شورِ طفلی ہے

بند دوم

مقصدِ دیدۂ امید ہے کل — گوہرِ عیش کی خرید ہے کل

دیدۂ مہرِ عالم آرا میں — سرمۂ عید کی کشید ہے کل

گلشنِ نوبہار ہستی میں — سبزہ عیش کی دمید ہے کل

کحلِ محراب ہر جبینِ نیاز — زینت افزائے عین عید ہے کل

اے مہِ نو ترا پیامِ طرب — ہے شنید آج چشم دید ہے کل

اے نسیم نشاطِ روحانی — باغِ دل میں تری وزید ہے کل

ہے یہی نغمۂ لبِ طفلی — ہاتھ لانا اِدھر کہ عید ہے کل

کمسنوں کو یہ کہہ رہا ہے ہلال — لو میاں شب بخیر عید ہے کل

سرِ بالیں لباسِ طفلی ہے — میری عریاں تنی کی عید ہے کل

اے مہِ نو خوشی ہو کیا جی کو

ترے آنے سے کیا یتیمی کو

بند سوم

جھوٹ ہے عید کا ہلال ہے تو
ساغرِ بادۂ ملال ہے تو

کہہ سُنا قصۂ ستم زدگاں
کہ ہمارا لبِ مقال ہے تو

ہستیِ سوز ہے نظارہ ترا
غازۂ عارضِ مقال ہے تو

اے گدائے شعاعِ پرِ توِ مہر
ہمہ تن کاسۂ سوال ہے تو

چشمۂ مہر پر نظر ہے تری
تشنہ کامِ مے کمال ہے تو

یہ دکھاوا ہے سب تلاشِ کمال
یا بہ منزلگہِ زوال ہے تو

ہائے شاید خبر نہیں تجھ کو
اپنی امید کا مآل ہے تو

بڑھ گیا خم مرے مقدر کا
کیوں نہ کہدیں کہ بے مثال ہے تو

میرے شوقِ لباسِ نو کے لئے
سبق آموزِ انفعال ہے تو

کیا بتاؤں تجھے کہ کیا ہوں میں
تجھ کو حسرت سے دیکھتا ہوں میں

بندِ چہارم

ستم گوشِ باغباں ہوں میں   خبرِ آمدِ خزاں ہوں میں
شرمسارِ متاعِ ہستی ہوں   مایۂ نازشِ زیاں ہوں میں
مجھ سے شرما گیا تبسم بھی   کہ سراپا لبِ فغاں ہوں میں
بار ہوں طاقتِ شنیدن پر   کس مصیبت کی داستاں ہوں میں
آہ منزل نہیں نصیبوں میں   موجۂ گردِ کارواں ہوں میں
اپنی بے مائگی پہ نازاں ہوں   مفت جاتا ہوں کیا گراں ہوں میں
اے فلک خوانِ زندگی پہ مگر   کوئی ناخواندہ میہماں ہوں میں
ستمِ ناروا سے مرتا ہوں   آسماں کا مزاج داں ہوں میں
آرزو یاس کو یہ کہتی ہے   اِک مٹے شہر کا نشاں ہوں میں

ایسی قسمت کسی کی ہوتی ہے
آہ میری اثر کو روتی ہے

بند پنجم

بن کے نشتر چبھا ہے تو دل میں　　آرزو ہو گئی لہو دل میں
چاکِ دل پر نثار ہوتی ہے　　حسرتِ سوزنِ رفو دل میں
یاس نقشہ جمائے جاتی ہے　　چھپتی پھرتی ہے آرزو دل میں
درد تیزی سے بڑھ گیا اے غم　　کیا رہی تیری آبرو دل میں
دو گھڑی بیٹھنے نہیں دیتی　　ہے کوئی چیز فتنہ خو دل میں
گرہِ رشتۂ حیات نہ ہو　　یہ جو ہوتی ہے آرزو دل میں
دیکھ اے یاس اب تلک باقی　　خونِ اُمید کی ہے بو دل میں
عمر تیری بڑی ہے یادِ پدر　　تھی ابھی تیری گفتگو دل میں
اے خیالِ مسرتِ طفلی　　آ گیا ہے کدھر سے تو دل میں

دردِ دل کا بھی کیا فسانہ ہے
خون رونے کا اِک بہانہ ہے

بند ششم

مصرِ ہستی میں شام آتی ہے — رنگ اپنا جمائے جاتی ہے

اے سبوئے مئے شفق اے شام — تو مئے بے خودی پلاتی ہے

سُرمۂ دیدۂ افق بن کر — چشمِ ہستی میں تو سماتی ہے

کس خموشی سے اُڑ رہے ہیں طیور — تو رہِ آشیاں دکھاتی ہے

ریزشِ دانہائے اختر کو — مزرعِ آسماں میں آتی ہے

تو پرِ طیرِ آشیاں رو کو — چشمِ صیاد سے چھپاتی ہے

صبح در آستیں ہے تو شاید — آنکھ اختر کی کھلتی جاتی ہے

تو پیامِ وفاتِ بیداری — محفلِ زندگی میں لاتی ہے

اپنے دامن میں بھر کے غنچہ و گل — خواب لے کر چمن میں آتی ہے

تیری تاثیر ہو گئی آخر

میری تقدیر ہو گئی آخر

بند ہشتم

آبرو جائے موت کی نہ کہیں — موت بن جائے بے کسی نہ کہیں

درد کو زندگی سمجھتے ہیں — جاوداں ہو یہ زندگی نہ کہیں

ہوں وہ بیکس کہ ڈرتا رہتا ہوں — چھوڑ دے مجھ کو بے کسی نہ کہیں

زخم منت پذیرِ مرہم ہے — چھپ کے سنتی ہو چاندنی نہ کہیں

غنچۂ دل میں ہے چٹک ایسی — اس کلی میں ہو بے کلی نہ کہیں

ہوں نفس در نفس مثالِ سحر — موت ہو میری زندگی نہ کہیں

گاہے ماہے ہلال آتا ہے — ہو لبِ جان مفلسی نہ کہیں

ماہ کے بھیس میں نمایاں ہو — اپنی تقدیر کی کجی نہ کہیں

خطِ دستِ سوال ہے اپنا — ہو رگِ جان مفلسی نہ کہیں

قابلِ بحر زندگی نہ ہوا
ٹکڑے ٹکڑے مرا سفینہ ہوا

بندِ ہشتم

سیر میں اب نہ دل لگائیں گے — کس کی اُنگلی پکڑ کے جائیں گے
صبح جانا کسی کا دہ گھر سے — اور وہ رونا کہ ہم بھی جائیں گے
کھیل میں آگئی جو چوٹ کبھی — کس کی آنکھوں سے اب چھپائیں گے
کوئی ناغہ جو ہوگیا تو کسے — ساتھ مکتب میں لے کے جائیں گے
سننے والے گزر گئے اے دل — اپنے شکوے کسے سُنائیں گے
اُٹھ گئے آہ قدرداں اپنے — لکھ کے تختی کسے دکھائیں گے
دردِ دل کی زباں نرالی ہے — تجھ کو اے خامشی سکھائیں گے
کس غضب کے نصیب ہیں اپنے — روتے آئے تھے روتے جائیں گے
عید آئی ہے اے لباسِ کہن — اب ترے چاک پھر سلائیں گے

عید کا چاند آشکارا ہوا
تیرِ غم کا جگر کے پار ہوا

بند نہم

آنکھ میں تار اشکِ پیہم ہے　　کیا رواں آبِ خنجرِ غم ہے

دیکھ اے ضبط گر نہ جائے کہیں　　اشکِ غم آبروئے ماتم ہے

اے مہِ عید تو ہلال نہیں　　سینہ کاوی کو ناخنِ غم ہے

پھول ایسا ہے اشکِ چشمِ یتیم　　رونقِ خانۂ محرّم ہے

اس گلستاں میں آشیاں ہے مرا　　ہر شجر جس کا نخلِ ماتم ہے

کس کے نظارۂ مصیبت کو　　ماہ بامِ فلک پہ یوں خم ہے

خونِ امید ہے یہ اشک نہیں　　کس بھلاوے میں چشمِ پرنم ہے

پوچھنا اے نفس نکل کے ذرا　　کیوں اجل کا مزاج برہم ہے

اے فلک کیوں زمیں ہے بر سرِ کیں　　میری بربادیوں کو تو کم ہے

ہے جو دل میں نہاں کہیں کیونکر

مفلسی کے ستم سہیں کیونکر

بندِ دہم

ہاتھ اے مفلسی صفا ہے ترا — ہائے کیا تیرِ بے خطا ہے ترا

تیرہ روزی کا ہے تجھی پہ مدار — بدنصیبی کو آسرا ہے ترا

مایۂ صد شکستِ قیمتِ دل — دہر میں ایک سامنا ہے ترا

تو بھلا مجھ پہ کیوں نثار نہ ہو — کہ یتیمی تو مُدّعا ہے ترا

مُسکراتا ہے تجھ کو دیکھ کے زخم — یہ کوئی صورت آشنا ہے ترا

العجب پر خموشیِ منعم — ایک فقرہ جلا بُھنا ہے ترا

یہ بھی کیا دامنِ یتیمی ہے — نام کیسا نکل گیا ہے ترا

موت مانگے سے بھی نہیں آتی — درد کیا زندگی مزا ہے ترا

شورِ آوازِ چاکِ پیراہن — لب اظہارِ مُدّعا ہے ترا

ہیں جہاں کو غموں کے خار پسند

اس چمن کو نہیں بہار پسند

بند یازدہم

چمنِ خار خار ہے دنیا — خونِ صد نو بہار ہے دنیا

زندگی نام رکھ دیا کس نے — موت کا انتظار ہے دنیا

ہے نسیمِ جہاں خزاں پرور — دیکھنے کو بہار ہے دنیا

ڈھونڈ لیتی ہے اِک نہ اک پہلو — درد کی غمگسار ہے دنیا

ہے تمنّا فزا ہوائے جہاں — کیا شکستِ خمار ہے دنیا

خون روتا ہے شوقِ منزل کا — رہزنِ رہ گزار ہے دنیا

جان لیتی ہے جستجو اُس کی — دولتِ زیرِ بار ہے دنیا

یاس و اُمید کا ملاوا ہے — کوئی جاتی بہار ہے دنیا

خندہ زن ہے فلک و دوں یہ جہاں — چرخ کی رازدار ہے دنیا

اہلِ دنیا دشرحِ دردِ جگر

رگِ بے خون و کاوشِ نشتر

بندِ دوازدہم

کیا قیامت ہیں غم کے آنسو بھی
بڑھتا جاتا ہے دردِ پہلو بھی

نوکِ مژگاں ہے نشترِ رگِ اشک
خوں فشاں ہو رہے ہیں آنسو بھی

ٹوٹی پھوٹی زباں میں کہتا ہے
رنگِ احوال دردِ پہلو بھی

سوزشِ اشکِ غم ہے برقِ مژہ
جل گیا سبزۂ لبِ جو بھی

آہ اے چشمِ اشک ریزِ یتیم
خواب کا اک خیال ہے تو بھی

حسرتِ دیدِ غم گسار نہ پوچھ
چشم ریزاں ہیں میرے آنسو بھی

قطرۂ خوں تو عام ہے لیکن
دل کو کہتے ہیں دردِ پہلو بھی

آ ترے صدقے اے خیالِ پدر
عید کا چاند ہو گیا تو بھی

ہائے اے برق بن گئی گر کر
میرے حاصل کی آبرو تو بھی

عید کا چاند اضطراب بنا
طاقِ آتش گہِ عذاب بنا

بند سیزدہم

طعن دیتا ہے کس بلا کے مجھے
آسماں بن گیا ستا کے مجھے

ہائے بے خود کیا تصور نے
داستان عرب سُنا کے مجھے

ہے تصدق مری یتیمی پر
کوئی نقشہ دکھا دکھا کے مجھے

چاہیئے اے خیالِ پاسِ ادب
تو کہاں لے گیا اُڑا کے مجھے

ہائے اے آتشِ فراقِ پدر
خاک کردے جلا جلا کے مجھے

اے یتیمی فتادگی بن کر
چھوڑنا خاک میں ملا کے مجھے

لبِ اظہار وا ہوا نہ کبھی
تم نے دیکھا ہے آزما کے مجھے

پردہ رکھ لے شکستہ پائی کا
کارواں لے چلے اُٹھا کے مجھے

زندگی کیا اسی کو کہتے ہیں
کہ مزے مل گئے فنا کے مجھے

عرش ہلتا ہے جب یہ روتے ہیں
کیا یتیموں کے اشک ہوتے ہیں

بند چہاردہم

کیا ہنسی ضبط کی اُڑاتے ہیں　　اشک آ آ کے چھیڑ جاتے ہیں

اک بہانہ ہلال عید کا ہے　　قوم کو حالِ دل سُناتے ہیں

کس مزے کی ہے داستاں اپنی　　قوم ہنستی ہے ہم ہنساتے ہیں

دیکھ اے زندگی مرے آنسو　　یہ ترے نقش نوٹاتے ہیں

ہاں بتا اے فلک کہ طفلی میں　　درد کو کس طرح چھپاتے ہیں

خاک راہِ فنا میں اُڑتی ہے　　مُنہ کفن میں چھپائے جاتے ہیں

وہ بھی ہوتے ہیں اے خدا کوئی　　جو مصیبت کو بھول جاتے ہیں

اس طرح کی ہے داستاں اپنی　　ہے عیاں جس قدر چھپاتے ہیں

ہم نہ بولیں تو خامشی کہہ دے　　یہ قیامت کے دُکھ اُٹھاتے ہیں

آبرو بڑھ گئی خموشی کی

یہ زباں بن گئی یتیمی کی

بند پانزدہم

رنگِ گلشن جو ہو خزاں کے لئے
قہر ہوتا ہے باغباں کے لئے

چاہیئے پاس برق کا اے دل
ہو خسِ خشک آشیاں کے لئے

اُڑ کے آتا ہے رنگ عارضِ زرد
کس مصیبت کی داستاں کے لئے

حال دل کا سُنا دیا سارا
کچھ بھی رکھا نہ رازداں کے لئے

ہے اقامت طلب جدا رمری
قوم ہو خضر اس مکاں کے لئے

ہاتھ اے قوم مہرباں تیرا
ابر ہے کس کے گلستاں کے لئے

حال اپنا اگر تجھے نہ کہیں
اور رکھیں اسے کہاں کے لئے

صورتِ شمع خانۂ مفلس،
خامشی ہے مری زباں کے لئے

اب مگر ضبط کا نہیں یارا
لب ترسنے لگے فغاں کے لئے

دردمندوں کی دردخواہ ہے قوم
بیکسوں کی اُمیدگاہ ہے قوم

حافظ شیرازی

پہلے راقم الحروف کا ارادہ تھا کہ مرقومہ ذیل اشعار کو باقیاتِ اقبال میں شامل نہ کیا جائے، مگر بعض احباب کا اصرار ہے کہ انہیں ضرور شائع کیا جائے اس لئے کہ، اگرچہ علامہؒ نے ان اشعار کو اسرارِ خودی کے دوسرے ایڈیشن میں سے حذف کر دیا تھا مگر علامہؒ کے خیالات میں کسی قسم کا تغیر نہ آیا تھا۔ لہٰذا یہ اشعار بطور ضمیمہ کے شائع کئے جاتے ہیں۔

بندۂ واحد

هوشیار از حافظِ صهبا گسار　　جامش از زهر اجل سرمایه دار

رهنِ ساقی خرقهٔ پرهیز او　　مے علاج هول رستاخیز او

نیست غیر از باده در بازار او　　از دو جام آشفته شد دستار او

چوں خراب از بادهٔ گلگوں شود　　مایه دارِ حشمتِ قاروں شود

مفتیِ اقلیم او مینا بدوش　　محتسب ممنون پیرِ مے فروش

طوف ساغر کرد مثلِ رنگِ مے — خواہمت فتویٰ از رباب و چنگ و نے

در رموزِ عیش و مستی کاملے — از خمِ خوں در دلے یا در گلے

رفت و شغلِ ساغر و ساقی گذاشت — بزم رندان و مے باقی گذاشت

چوں جرس صد نالۂ رسوا کشید — عیش ہم در منزلِ جاناں ندید

در محبّت پیروِ فرہاد بود — برلبِ او شعلۂ فریاد بود

تخم نخلِ آہ در کہسار کاشت — طاقتِ پیکار با خسرو نداشت

مُسلم و ایمان او زنار دار — رخنہ اندر دینش از مژگان یار

آنچناں مستِ شراب بندگی است — خواجہ و محروم ذوقِ خواجگی است

"دعویٰ او نیست غیر از قال و قیل" — "دست او کوتاہ و خرما بر نخیل"

آں فقیہ ملّت می خوارگان — آں امام امّت بیچارگان

گوسفند است و نوا آموخت است — عشوہ و ناز و ادا آموخت است

دلربائیہائے او زہر است و بس — چشم او غارتگر شہر است و بس

ضعف را نام توانائی دہد
ساز او اقوام را اغوا کند

از بز یونان زمین زیرک تر است
پردۂ عودش حجابِ اکبر است

نغمۂ چنگش دلیلِ انحطاط
ہاتفِ او جبرئیلِ انحطاط

بگذر از جامش کہ در مینائے خویش
چوں مریدان حسن دارد حشیش

از تخیل جنّتے پیدا کند
مر ترا بر نیستی شیدا کند

ناوک اندازے کہ تاب از دل برد
ناوک او مرگ را شیریں کند

مار گلزارے کہ دارد زہر ناب
صید را اوّل ہمی آرد بخواب

عشق با سحر نگاہش خودکشی است
کشتنش مشکل کہ مار خانگی است

حافظِ جادو بیاں شیرازی است
عرفیؔ آتش زباں شیرازی است

ایں سوئے ملکِ خودی مرکب جہاند
آں کنار آب رکن آباد ماند

ایں قتیل ہمّت مردانۂ
آں ز رمزِ زندگی بیگانۂ

دست ایں گیرد ز انجم خوشۂ
چشم آں از اشک دارد توشۂ

روزِ محشر رحم اگر گوید بگیر — عرفیا! فردوس و حورا ء حریر
غیرتِ او خندہ بر حورا زند — پشت پا بر جنّت الماویٰ زند
بادہ زن با عرفیِ ہنگامہ خیز — زندہ؟ از صحبتِ حافظ گریز
ایں فسوں خواں زندگی از ما ربود — جامِ او شانِ جمی از ما ربود
محفلِ او درخورِ ابرار نیست — ساغرِ او قابلِ احرار نیست

بے نیاز از محفلِ حافظ گذر
الحذر از گوسفنداں الحذر

محمد کرامت اللہ عثمانی منیجر مشہور آفسٹ لیتھو پریس، میکلوڈ روڈ کراچی نے طبع کیا اور مجلس اقبال کراچی نے شائع کیا۔